uneven pages with in book only

رجسٹرڈ نمبر ایل ۱۳۶۲

اُٹھو وگرنہ حشر نہیں ہوگا پھر کبھی
دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا
(ہمایوں)

بیادگار علامہ فضیلت مآب آنریبل جسٹس میاں محمد شاہ دین صاحب ہمایوں مرحوم

اُردو کا علمی و ادبی ماہوار رسالہ

ہُمایُوں

ایڈیٹر: بشیر احمد، بی۔ اے (آکسن) بیرسٹر ایٹ لا
جائنٹ ایڈیٹر: حامد علی خاں، بی۔ اے

فہرستِ مضامین

جلد ۲۴ — ہمایوں بابت ماہِ دسمبر ۱۹۳۳ء — نمبر ۶

تصاویر:- (۱) پھول بازار (۲) شادی کے بعد

قیمت فی پرچہ ۸ر — چندہ سالانہ پانچ روپے چھ آنے مع محصول — ششماہی ۳ ے ر مع محصول

طلسمِ زندگی

یعنی

جناب میاں بشیر احمد صاحب بی۔اے (آکسن) مدیر "ہمایوں" کی تازہ تصنیف کے متعلق

اہلِ ملک کی رائیں

میاں عبدالعزیز صاحب بیرسٹر ایٹ لا صدر بلدیہ لاہور

"طلسمِ زندگی" کے ملتے ہی جلد اور چھپائی کی خوبصورتی دیکھ کر جب فہرست مضامین پر نظر ڈالی تو دل نہ چاہا کہ اس کتاب کو بغیر پڑھے اور ختم کئے چھوڑا جائے اور نہ چھوڑا جا سکتا ہے میں نے اس کتاب کو اپنی میز پر رکھ لیا ہے تاکہ وقتاً فوقتاً اس کے کسی نہ کسی مضمون کو دوبارہ سہ بارہ بلکہ متواتر پڑھا جائے یہ ایک خوبصورت چھوٹے چھوٹے مگر قیمتی موتیوں کی لڑی ہے۔ آپ نے صرف کثیر سے اس کو مرتب کر کے شائع کیا ہے اور حضرت ہمایوں مرحوم کی یاد تازہ کر دی ہے۔ خدا آپ کو اس کا صلہ بخشے۔

میر سعادت حسین صاحب نجیب مہتمم گنڈہ حیدرآباد دکن

"طلسمِ زندگی" آرائشِ ظاہری کے باعث بحد نظرافروز اور حسنِ معنوی کی وجہ سے نہایت روح افزا ہے کتاب کو دیکھ کر طبیعت پھڑک گئی اور جی باغ باغ ہو گیا۔

چودھری محمد ضیاء الدین صاحب شمسی جرنلسٹ

میں مفصل رائے تو ساری کتاب پڑھ کر لکھوں گا لیکن اتنا کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ مرقع چغتائی کے بعد یہ پہلی کتاب ہے جو اس شان کے ساتھ شائع ہوئی ہے اسے دیکھ کر میں بلا خوفِ تردید کہہ سکتا ہوں کہ یہ ایک زندہ مصنف کی زندہ زبان میں زندہ رہنے والی تصنیف ہے۔ کتابت، طباعت، تصاویر، جلد ہر چیز نظر فریب اور دیدہ زیب ہے، اور آپ کے حسنِ مذاق کی شاہد۔

کاش آپ کا اندازِ تحریر میرے مقدر میں بھی ہوتا!

قیمت ——— پانچ روپے ——— علاوہ محصول ڈاک

ملنے کا پتہ } سید عبداللطیف۔ دفتر رسالہ ہمایوں ۲۳ لارنس روڈ لاہور



ہمایوں کا بارہواں سالگرہ نمبر

مفت



جنوری سنہ ۱۹۳۷ء میں "ہمایوں" کی بارہویں سالگرہ ہے۔ اس مسرت انگیز تقریب پر اس دفعہ "ہمایوں" کا سالگرہ نمبر نہایت اہتمام سے شائع کیا جائیگا۔ یہ پرچہ اپنی بعض خصوصیات کے لحاظ سے خود "ہمایوں" کے سالگرہ نمبروں میں بھی ممتاز ہوگا۔ ظاہری و معنوی محاسن کے اعتبار سے یہ نفیس اور ضخیم مجموعۂ ادب کتب خانوں کی زینت بننے کے قابل ہوگا:-

سرورق۔ کسی حیرت کار مصوّر کے انوکھے خیال کا مرقع ہوگا۔

تصاویر۔ جو عرصۂ دراز کی تحقیق اور جستجو کے بعد بصرفِ زرِ کثیر حاصل کی گئی ہیں۔ اپنی مثال آپ ہوں گی۔

علمی و ادبی مضامین ایسے گراں پایہ ہونگے کہ خود "ہمایوں" کو اُن پر ناز ہوگا۔

افسانے جو سحر طراز افسانہ نگاروں کے سرمایۂ ناز کارناموں سے منتخب ہوں گے دنیا کے کاروبار سے تھکے ہوئے دماغوں کو شعر و ادب کی پُرسکون اور کیف انگیز طلسماتی فضاؤں میں لے جائیں گے۔

حصۂ نظم۔ بہترین نقادوں اور شاعروں کا انتخاب اور جادو نگار شعرا کے دلآویز تخیّل کا عطر ہوگا۔

مزاحیہ مضامین اور حکیمانہ نکتے اہلِ ذوق کی تفریح کا سامان فراہم کریں گے

سالگرہ نمبر کے دوسرے محاسن نظر پرور اور روح افزا ہوں گے۔

"ہمایوں" میں پاکیزگیٔ مذاق اور لطافتِ خیال کا بہت اہتمام ہوتا ہے۔ مخربِ اخلاق تصاویر، اشتہارات اور مضامین وغیرہ اس میں شائع نہیں ہوتے اسی لئے یہ رسالہ بہ تعدادِ کثیر خواتین اور طلبہ کے ہاتھوں میں جاتا ہے۔

مفت

سالگرہ نمبر کی قیمت کم از کم ایک روپیہ فی جلد ہوگی لیکن اگر آپ ۱۵ دسمبر تک پانچ روپے چھ آنے مع محصول سالانہ چندہ بھیج کر خریدار بن جائیں تو یہ پرچہ آپ کو مفت ملیگا اور اس کے علاوہ دسمبر سنہ ۱۹۳۷ء تک "ہمایوں" جیسا موقر ادبی رسالہ آپ کو مطالعہ کے لئے ملتا رہے گا۔ جو حضرات تین روپے مع محصول ششماہی چندہ بھیجیں گے انہیں بھی سالگرہ نمبر مفت ملیگا۔ آج ہی درخواستیں بھیج دیجئے کیونکہ پرچہ محدود تعداد میں شائع ہوگا اور ختم ہوجانے پر کسی قیمت میں مہیا نہ ہوسکے گا:-

سید عبداللطیف مینجر رسالہ "ہمایوں" ۲۳ لارنس روڈ لاہور

جہاں نما

وحشیانہ تفریحات

مرغ بازی

"چیمبرز جرنل" میں "انسان کے بہیمانہ کھیل" کے عنوان سے ایک دلچسپ مضمون شائع ہوا ہے۔ راقم نے لکھا ہے کہ تقریباً ہر ملک میں تفریح کا یہ وحشیانہ طریقہ رائج ہے کہ لوگ دو جانوروں کو باہم لڑا کر ان کی ہلاکت کے تماشے سے اپنے تفنن طبع کا سامان بہم پہنچاتے ہیں۔

انگلستان میں اب تک مرغ بازی کا رواج ہے اور عدالتوں میں جو مقدمات اس سلسلے میں طے ہوتے ہیں اُن سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر طبقے کے لوگ مرغوں کی لڑائی سے دلچسپی رکھتے ہیں چنانچہ مرغ بازوں کی خوب حوصلہ افزائی کی جاتی ہے اور لڑائی کے لئے اچھے سے اچھے مرغ پال کر تیار کئے جاتے ہیں۔

بعض دفعہ دو حریف اپنی طرف سے ایک سے زائد مرغے لڑائی کے لئے پیش کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ ایک حریف اپنے حریف کے تیرہ مرغوں کے مقابلے میں اپنے تیرہ مرغے پالی میں لاتا ہے کبھی کبھی ایسے موقعوں پر ایک ایک ہزار پاؤنڈ کی شرط باندھی جاتی ہے۔

سگ بازی

انگلستان میں ایک اس سے بھی زیادہ وحشیانہ کھیل رائج ہے۔ اسے سگ بازی کہہ سکتے ہیں۔ یہ مرغ بازی سے بھی زیادہ ظالمانہ تفریح ہے۔ سگ بازی کے لئے عموماً بُل ٹیریر پالے جاتے ہیں۔ ان کتوں میں بُل ڈاگ کی جرأت اور ٹیریر کی تندی اور جوش مل کر انہیں اس مقصد کے لئے خاص طور پر موزوں بنا دیتا ہے۔ یہ تند مزاج کتے لڑائی کے لئے خاص طور پر تیار کئے جاتے ہیں اور ابھی یہ پلے ہی ہوتے ہیں کہ انہیں ایک دوسرے کو چیرنے پھاڑنے کا سبق دیا جاتا ہے۔ کتوں کی لڑائی اس قدر وحشیانہ ہوتی ہے کہ اس کو بیان کرنے سے قلم قاصر ہے۔ یہ انتہائی بربریت کا نظارہ اُس وقت تک ختم نہیں ہوتا جب تک کہ ایک کتا مر نہیں جاتا یا کم از کم مرنے کے قریب نہیں ہو جاتا۔

ہاتھیوں کی لڑائی

مرغوں اور کتوں کی لڑائی ہندوستان کے طبقہ ادنیٰ میں بھی رائج ہے۔ لیکن ہاتھیوں کی لڑائی سے امرا بھی لطف اندوز

ہوتے ہیں۔

ہاتھیوں پر مہاوت سوار ہوتے ہیں اور دونوں ہاتھیوں کے درمیان ایک نیچی سی دیوار حائل ہوتی ہے۔ لڑائی اُس وقت تک جاری رہتی ہے جب تک ایک ہاتھی ہار کر بیٹھ نہ جائے۔

لیکن ہاتھیوں کی حقیقی لڑائی اس سے بہت زیادہ خوفناک ہوتی ہے۔ اس صورت میں اُن پر مہاوت سوار نہیں ہوتا بلکہ دونوں ہاتھی نہایت خونخوار طریقے سے باہم لڑائے جاتے ہیں اور جب تک ایک ہاتھی دوسرے ہاتھی کو اپنے دانتوں وغیرہ سے چیر پھاڑ نہ ڈالے لڑائی جاری رہتی ہے۔ بعض اوقات کسی چیتے یا گینڈے کو بھی ہاتھی سے لڑا دیتے ہیں۔

جھینگروں کی لڑائی

چین اور فلپائن میں ایک عجیب وغریب تفریح رائج ہے۔ اس میں مرغوں، کتوں یا ہاتھیوں کے بجائے دو جھینگر باہم لڑائے جاتے ہیں۔ چینیوں میں عوام کو یہ کھیل بہت مرغوب ہے۔ چنانچہ ہزاروں کی تعداد میں لوگ اسے دیکھنے کے لئے جمع ہوتے ہیں۔ یہ ظاہر ہے کہ اس کھیل کی نوعیت کے پیش نظر سب لوگ بچشم خود کھیل کا نظارہ نہیں کرسکتے صرف ریفری اور منصف ہی کھیل کو دیکھتے ہیں اور جس طرح فٹ بال وغیرہ کے بڑے میچوں میں ریڈیو کے ذریعہ سے وقتاً فوقتاً کھیل کی حالت سے لوگوں کو مطلع کیا جاتا ہے اسی طرح جھینگروں کی لڑائی کے متعلق بھی ساتھ ساتھ اعلان ہوتا رہتا ہے۔ جھینگروں کی لڑائی عموماً مٹی کی ایک چھوٹی سی تشتری میں ہوتی ہے۔ اور چوہے کی مونچھوں کے برش سے چھوکر وہ لڑنے پر آمادہ کئے جاتے ہیں۔ یہ لڑائی بھی اُس وقت تک جاری رہتی ہے جب تک ایک جھینگر مر نہ جائے۔ کیونکہ جو لوگ جھینگروں کی لڑائی پر شرطیں باندھتے ہیں وہ اُس وقت تک مطمئن نہیں ہوتے جب تک کہ ان کے جھینگر کی ہار جیت کا فیصلہ موت نہ کردے۔

گھوڑوں کی لڑائی

جزائر فلپائن میں ایک اور کھیل سے بہت دلچسپی لی جاتی ہے۔ یہ گھوڑوں کی لڑائی ہے۔ مقامی امراء اس مقصد کے لئے گھوڑوں کی خاص طور پر تربیت کرتے ہیں۔ یہ لڑائی اس لحاظ سے عجیب ہوتی ہے۔ کہ ایک دوسرے پر حملہ کرنے کے لئے گھوڑوں کے پاس بجز دانتوں کے اور کچھ نہیں ہوتا۔ گھوڑوں کو لڑائی پر اُکسانے کے لئے ایک نوجوان گھوڑی درمیان لائی جاتی ہے۔ یا ان کی آنکھوں پر سورج کی روشنی کا عکس ڈالا جاتا ہے۔ گھوڑے عموماً ایک دوسرے کو گردن پر کاٹتے ہیں۔ اور جب ایک گھوڑا ہار جاتا ہے تو لڑائی ختم ہو جاتی ہے۔

حکومتِ امریکہ اس کھیل کے سدّباب کی کوشش میں مصروف ہے۔

حیدرآباد کی تعلیمی ترقی

جدید تعلیمی ادارات اور تعلیم کا روزافزوں شوق

حکومتِ دکن کی رپورٹ بابت ۱۳۴۰ فصلی میں دکن کی تعلیمی ترقی کی روئداد بہت امیدافزا اور قابل تعریف ہے۔ نہ صرف تعلیمی اداروں کی تعداد میں ترقی ہوئی ہے بلکہ طلبہ کی تعداد میں بھی نمایاں اضافہ ہوا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اہلِ دکن نہایت سرعت کے ساتھ تعلیم و تہذیب کے بلند مدارج پر پہنچنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ پہلے کل ۴۲۵۶ تعلیمی ادارات تھے۔ اب ان کی تعداد ۴۲۸۵ ہے۔ طلبہ کی کل تعداد پہلے ۲۹۱۹۲۰ تھی اور اب ۲۹۹۹٦۳ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بہ حیثیتِ مجموعی ۲۹ مدارس اور ۸۰۴۳ طلبہ کا اضافہ ہوا۔

شعبہ جات تعلیم پر بہ حیثیتِ مجموعی جو خرچ ہوتا ہے۔ وہ ۹۰۹۷۰۸۱ روپے سے بڑھ کر ۹۸۹۹۹۱۳ روپے ہو گیا ہے ۴۲۸۵ مدارس میں سے ۳۵۹۸ لڑکوں کے لئے ہیں اور ٦۸۷ لڑکیوں کے لئے ہیں ان کے طلبہ اور طالبات کی تعداد علی الترتیب ۲۵٦۳۹۴ اور ۴۳۵٦۹ ہے۔ گزشتہ سال کی رپورٹ سے مقابلہ کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ لڑکوں کے مدارس میں ۲٦ کا اضافہ ہوا اور ۵۸۴۸ طلبہ بڑھے۔ لڑکیوں کے مدارس میں تین کا اضافہ ہوا۔ اور ۲۱۸۵ نئی لڑکیاں مدارس میں داخل ہوئیں۔ لڑکیوں کی تعداد میں یہ سریع اور اہم اضافہ نہایت امیدافزا ہے۔

تعلیمی ادارات کی تفصیلی تشریح حسبِ ذیل ہے:-

(۱) دس کالج
(۲) تیس مدارسِ فوقانیہ
(۳) ایک سو تئیس مدارسِ وسطانیہ
(۴) چار ہزار اکتالیس ابتدائی مدارس
(۵) اکسٹھ مدارسِ خاص

بجز انگریزی ہائی سکولوں کے جن کے طلبہ میں ۱۴۲ کی کمی ہوئی باقی تمام تعلیمی ادارات میں گزشتہ سال کے مقابلہ میں طلبہ کی تعداد میں معتدبہ اضافہ ہوا۔

مختلف تعلیمی ادارات میں طلبہ کا فیصدی تناسب حسبِ ذیل ہے۔

(۱) کالجوں میں :- ۴ء
(۲) مدارسِ فوقانیہ میں :- ۷
(۳) مدارس وسطانیہ میں :- ۱۰
(۴) ابتدائی مدارس میں :- ۸۱
(۵) مدارس خاص میں :- ۱ء٦

نواہائے راز

بیداد تری چرخِ جفا جُو نہیں جاتی
میں چُپ ہوں پرانی یہ مری خُو نہیں جاتی

مینا ہے وہی اور وہی بادۂ رنگیں،
اِس دل سے تری یاد پری رُو نہیں جاتی

گلزار کے سایوں میں وہی حشر بپا ہے
پھولوں سے ابھی تک تری خُوشبو نہیں جاتی

سو جلوے سے محروم ہے میری نگہِ تنگ
تو سامنے ہر سُو ہے یہ ہر سُو نہیں جاتی

میں اور جنوں محرمِ منزل ہیں پر اے عقل
جب جاتے ہیں اُس بزم میں ہم تُو نہیں جاتی

حامد علی خاں

جرمنی میں نسلی منافرت کی تحریک

نازیوں کی حکمتِ عملی کا تجزیہ

حال ہی میں دنیا کی توجہ جرمنی کی اُس زبردست تحریک کی طرف منعطف ہوگئی ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ یہودی النسل لوگ جرمن شہریّت کے حقوق سے یک قلم محروم کردیئے جائیں۔ نازی حکومت نے نہ صرف یہودی ڈاکٹروں کو ہسپتالوں سے خارج کردیا ہے، یہودی ججوں کو اپنی عدالتوں سے نکال دیا ہے، یہودی وکیلوں کو وکالت کرنے سے روک دیا ہے اور یہودی اُستادوں اور پروفیسروں کو تعلیمی اداروں کی رُکنیت سے جواب دے دیا ہے بلکہ یہودی طلبہ کا داخلہ بھی صنعتی مدارس میں ممنوع قرار دے دیا ہے۔ اِس طرح جرمنی کے دس لاکھ سے زائد یہودی باشندے اڈالف ہٹلر کی اِس زبردست معاندانہ تحریک سے بالواسطہ یا بلاواسطہ متاثر ہوئے جس کا بیڑا اس نے یہودیوں کے خلاف اُٹھا رکھا ہے۔ ڈاکٹر ٹکمار پا نے حال ہی میں نہایت قابلیت سے نازیوں کے نقطۂ نظر کی توضیح کی ہے اور موجودہ صورتِ حالات پر ایک سرسری نظر ڈالی ہے۔ وہ لکھتے ہیں: "۱۹۲۵ء کی مردم شماری سے معلوم ہوا تھا کہ صرف ریش میں ۹۷۳۴۶۵ یہودی آباد تھے اور اب کچھ عرصہ قبل اندازہ کیا گیا کہ اُس وقت سے لے کر اب تک اس آبادی میں صرف چند ہزار کا اضافہ ہوا۔ ۱۹۲۵ء میں یہودی ریش کی کُل آبادی کا ۹ء نیصدی حصّہ تھے۔ جرمنی میں یہودیوں کی سب سے زیادہ آبادی پرشیا میں تھی۔ جہاں اُن کی تعداد ۵۹۶۹۰۴ یعنی آبادی کے ۷ء نیصدی حصے سے زیادہ تھی۔ دوسرے ملکوں کی طرح جرمنی کے یہودی بھی زیادہ تر شہروں ہی میں آباد تھے تقریباً اُن کا دو تہائی حصّہ ایسے شہروں میں رہتا تھا جن کی آبادی ایک لاکھ یا اس سے زیادہ تھی اور دس ہزار یا اس سے کم آبادی کے قصبوں میں صرف ۱ء نیصدی یہودی تھے۔ یہ تناسب دوسری جرمن آبادی سے مقابلہ کرنے پر عجیب معلوم ہوتا ہے کیونکہ ۱۹۲۵ء میں کل جرمن آبادی کا ۳ء۵ فیصدی حصّہ دس ہزار یا اس سے کم آبادی کے شہروں میں آباد تھا۔ نازیوں کے برسرِ اقتدار ہونے سے پہلے نظامِ حکومت میں یہودیوں کو مساوی شہری اور سیاسی حقوق حاصل تھے ریش کے نظامِ حکومت کا ضابطہ ۱۳۶ حسب ذیل ہے "شہری اور سیاسی فرائض کی انجام دہی نہ تو مذہبی آزادی سے کسی طرح متاثر ہوسکتی ہے اور نہ اس سے اُن پر کسی قسم کی قیود عائد ہوتی ہیں۔ شہری اور سیاسی حقوق کا دروازہ بلا امتیازِ مذہب و ملّت ہر شخص کے لئے یکساں کھلا ہے۔" اس سے پہلی دفعہ صاف طور پر کہتی ہے کہ "ریش کے تمام باشندوں کو مذہب اور عقائد کی آزادی حاصل ہے اور خود نظامِ حکومت پوری مذہبی آزادی کا ذمہ لیتا ہے۔" کہتے ہیں کہ ان تحفظات کے باعث نازی اقتدار سے پہلے یہودیوں کو پوری قانونی مساوات حاصل تھی۔ اگرچہ اس زمانے میں بھی کسی حد تک معاشری اور اقتصادی امتیاز روا رکھا جاتا تھا لیکن اس قسم کے کھلے ہوئے معاندانہ جذبات کا جو آج کل یہودیوں کے خلاف بھڑک اُٹھے ہیں کہیں شائبہ تک نہ تھا۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ یہودیوں کے خلاف جرمنوں نے موجودہ طرزِ عمل اختیار کرنا کیوں جائز سمجھا۔

ایک نئی قومیّت پرستی

نازیوں کے طریق کار اور جرمنی کے موجودہ واقعات کو سمجھنے کے لئے وہ مقولہ پیش نظر رکھنا چاہیئے جس کے متعلق ولیم جیمز نے کہا تھا کہ میں نے آج تک

اس سے زیادہ فلسفیانہ قول نہیں سُنا وہ مقولہ یہ ہے :۔ ”آدمی آدمی میں تھوڑا ہی فرق ہے لیکن جتنا بھی ہے خوفناک حد تک اہم ہے“ اگر یہاں آدمی کے بجائے ہم نسل یا قوم کا لفظ رکھ دیں اور پھر اُن مفروضات پر غور کریں جو نازی نظامِ عمل کے محرک ہیں تو ہم جرمنی کے موجودہ طرزِ عمل کو سمجھنے میں کامیاب ہوسکتے ہیں۔ نیڈر جو ہٹلر کا ایک روحانی باپ اور نازی تحریک کا سرچشمہ ہے کہتا ہے کہ ہمارے اور اغیار (غیر نازیوں) کے درمیان ایک آتشیں شمشیر کا ناقابلِ عبور پل حائل ہے یہ شمشیر ہمارا عمومی نقطۂ خیال ہے۔ ہر روزن برگ کہتا ہے کہ جرمن قوم ایک مخصوص قوتِ عمل اور ایک خاص نسلی امتیاز کی حامل ہے ہم خالص جرمن تہذیب و تمدن کے وارث ہیں۔ وہ عظیم الشان سلطنت جو جرمنوں نے قائم کر رکھی تھی اور جو چار سال کے طویل عرصے تک دنیا بھر کا مقابلہ کرتی رہی محض اس لئے شکست کھا گئی کہ اُسے روحانی ”زہروں“ نے کمزور کر دیا تھا۔ ان زہروں (مثلاً عالم گیر تہذیب کا عقیدہ بمقابلہ جرمن تہذیب کے، بین الاقوامیت، امنیت اور صلح جوئی وغیرہ) نے نازیوں کی محبوب خالص اشتراکیت سے مل کر ایک شیطانی مرکب تیار کیا جسے مارکسین ازم کا نام دیتے ہیں۔ اس کی مدد سے بین الاقوامی یہودی سرمایہ داری نے جو دنیا بھر پر چھا رہی ہے۔ جرمنی کی مزدور پیشہ جماعت کو بھی اُلّو بنا کر صحیح راستے سے بھٹکا دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بین الاقوامی سرمایہ داری کو مٹانے کے لئے مزدوروں کی بہترین کوششیں بیکار ثابت ہو رہی ہیں۔ مارکس کی تعلیم میں جو جماعت کے مقابلے میں موجد اور ذہین افراد کی حیثیت تسلیم نہیں کرتی نازیوں کو مادیت کی انتہا نظر آتی ہے اس لئے وہ انتہائی اشتراکیت سے لے کر معتدل اصلاحیت تک مارکس کے ہر نظریے کو تباہ کر دینا چاہتے ہیں لیکن ان کا خیال ہے کہ تنہا یہی علاج اس وقت تک کافی نہیں ہو سکتا جب تک کہ اُس جرثومے کو بھی ہلاک نہ کر دیا جائے جس نے جرمن خون کو مسموم کر کے جرمنوں کی روح کو مردہ کر دیا ہے۔ انہیں یقین ہے کہ یہودیوں کے خلاف ایک بے رحمانہ جنگ کا آغاز ضروری ہے۔ ہر روزن برگ کا قول ہے کہ یہودیوں کے اثر و رسوخ کے ازالے کے بعد طبقۂ متوسط اور مزدوروں کا اتحاد ممکن ہو سکے گا طبقۂ متوسط کو بین الاقوامی سرمایہ داری نے تباہ کر کے ایک ایسی جماعت میں تبدیل کر دیا ہے جو مادیت اور افادیت کی روح سے یکسر عاری ہے۔ جرمن مزدور اب کبھی یہ خلافِ قومیت غلطی نہ کریں گے کہ وہ ملکی آجروں کے مقابلے میں غیر ملکی مزدوروں سے رشتۂ موافقت استوار کریں۔ آئندہ جرمن تہذیب اور قومیت کی عمارت خالص نسلی اور قومی نقطۂ نظر کی بنیاد پر کھڑی ہوگی۔

جدید نسلی حکمتِ عملی

جرمنی کے گزشتہ شش سالہ اقتصادی اور سیاسی بحران، عہد نامۂ ورسائی کی عارضی اور دائمی ناانصافیوں اور ہٹلر کی زبردست اور پُرجوش فصاحت نے ایک دور رس نتائج پیدا کرنے والی روحانی تحریک کو نشوونما دی ہے۔ جرمنوں نے لاتعداد ایسی کتابیں لکھی ہیں جو قومی اشتراکیت کی مختلف صورتوں کے ارتقا کا باعث ہوئی ہیں اور اب جرمنی کے دشمنوں کے خلاف ایک مقدس جنگ کی آگ بھڑک اٹھی ہے۔ آج کل خالص نسلی امتیازات کے لئے بھی جواز کے نیم علمی دلائل پیدا ہوگئے ہیں۔ جرمنی کے وطن پرست نازیوں کی ہر اصلاح کو جائز قرار دیتے ہیں۔ ماہرینِ اقتصاد فریڈرش لسٹ کے مداح ہو رہے ہیں اور وہ اب اس نظریے کے حامی بن گئے ہیں کہ قوم کو اپنی اقتصادی ضروریات کے لئے کسی دوسرے کا دست نگر نہ ہونا چاہیئے۔ اس کے ساتھ ہی اس تحریک کے حامی اٹلی سے قریبی رشتہ پیدا کر رہے ہیں اور وہاں کی فاسی

تحریک کا بہ غور معائنہ کرتے رہے ہیں لیکن ہٹلر نے نازی نظام عمل میں کوئی تبدیلی نہیں کی اور یہ نظام عمل اب بھی وہی ہے جو ۱۹۲۰ء میں تھا۔ جرمن معاشرہ کو از سرِ نو منظم کرنے کے لئے نازیوں کی تحریک میں جو ۲۴ تجاویز مدِ نظر رکھی گئی ہیں وہ فرداً فرداً اور اجتماعاً یہودیوں اور ان کے اثر کے قلع قمع ہی پر منتج ہوتی ہیں۔ پانچ کا تعلق قومی اور سیاسی مقاصد سے ہے اور تیرہ کا معاشری اور اقتصادی نظریوں سے۔ پہلی پانچ تجاویز پر عمل شروع کر دیا گیا ہے اور دوسری تیرہ تقریباً معرضِ عمل میں آ چکی ہیں۔ باقی سات تجاویز معاشری حکمتِ عملی کی روح ہیں جن پر عمل کرنے سے بہت سی مشکلات پیدا ہونے کا امکان ہے۔ یہاں یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ یہودیوں کے خلاف عناد کا جو طوفان اٹھا اُس کے پہلے رہلے بعد کے مقابلۃً معتدل ریلوں سے بدرجہا زیادہ زبردست تھے۔ نظامِ عمل کی وہ سات تجاویز جن کا تعلق براہِ راست یہودیوں اور دوسرے "نامطبوع لوگوں" سے ہے حسبِ ذیل ہیں:۔

(۴) صرف ہماری قوم (Volksgenosse) کے رکن ہی شہری کہلا سکتے ہیں۔ ہماری قوم کے لوگ صرف وہی ہیں جن کی رگوں میں جرمن خون دوڑ رہا ہے، خواہ ان کا کچھ ہی عقیدہ کیوں نہ ہو۔ اس لئے کوئی یہودی ہماری قوم میں شامل نہیں ہو سکتا۔

(۵) ہر وہ شخص جو شہری نہیں جرمنی میں بطور مہمان کے رہ سکتا ہے اور اس پر وہ تمام قوانین عائد کئے جائیں گے جن کا تعلق اجنبیوں سے ہے۔

(۶) صرف شہریوں ہی کو قائد کے انتخاب اور قوانینِ سلطنت کے انضباط کا فیصلہ کرنے کے اختیارات حاصل ہیں۔ اس لئے ہم مطالبہ کرتے ہیں کہ ہر عام ادارہ خواہ وہ کسی نوع کا ہو ریش میں ہو یا ریاستوں میں یا مجالس میں صرف شہریوں ہی سے پُر کیا جائے۔

(۷) ہم مطالبہ کرتے ہیں کہ سلطنت شہریوں کے روزگار کا انتظام اپنے ہاتھوں میں لے اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو پوری آبادی کو خوراک بہم پہنچائے۔ غیر شہری ریش سے خارج کر دیئے جائیں۔

(۸) غیر جرمن آئندہ ملک میں سکونت اختیار کرنے سے قطعاً روک دیئے جائیں۔ ہم مطالبہ کرتے ہیں کہ تمام غیر جرمن جو ۲۔ اگست ۱۹۱۴ء سے لے کے اب تک جرمنی میں آباد ہوئے ہیں۔ ریش سے خارج ہونے پر مجبور کئے جائیں۔

(۲۳) ہم مطالبہ کرتے ہیں کہ سیاسی دروغ گوئیوں اور جرائد کے ذریعے سے ان کی نشر و اشاعت کا قانونی طور پر سدِ باب کیا جائے۔ جرمن صحیفہ نگاری کی طاقت کے استحکام کے لئے ہمارے مطالبات حسب ذیل ہیں:۔

آ۔ جرمن زبان میں شائع ہونے والے اخبارات کے ایڈیٹر اور کارکن صرف ہماری قوم کے افراد ہونے چاہئیں۔ غیر جرمن اخبارات حکومت کی اجازت کے بغیر شائع نہ ہو سکیں۔

ب۔ کسی جرمن اخبار میں غیر جرمن سرمائے کی حصہ داری یا کسی اور قسم کا اثر قانوناً ممنوع ہو۔ خلاف ورزی کی صورت میں اخبار کی ضبطی اور اُس غیر جرمن کے ریش سے اخراج کی سزا دی جائے۔

وہ اخبارات جو قومی مفاد کے خلاف کام کریں بند کر دیئے جائیں۔ فنونِ لطیفہ اور ادبیات میں تمام اس قسم کے اثرات کی روک تھام کی جائے جو ہماری قومی زندگی پر مضر اثرات ڈالتے ہیں اور وہ تمام ادارے جو اس قسم کے اثرات پیدا کر رہے ہوں بند کر دیئے جائیں۔

(۲۴) ہم سلطنت میں تمام مذاہب اور فرقوں کی کامل آزادی کا مطالبہ کرتے ہیں بشرطیکہ ان کا وجود یا اُن کے افعال سلطنت یا جرمن نسل کے رسوم و اخلاق کے نقیض نہ ہوں۔

جرمنوں کی یہ جماعت ایک قسم کی وسیع المعنی عیسائیت کی دعوےدار ہے جس کا کسی خاص فرقے یا عقیدے سے تعلق نہیں یہ یہودی سرمایہ داری کے خلاف جنگ کرنا چاہتی ہے اور اسے یقین ہے کہ جرمن قوم کی نجات کا راز اسی کی پیش کردہ تجاویز میں پنہاں ہے۔

یہودیوں میں دوسروں سے الگ تھلگ رہنے کی خصوصیّت

جرمنی میں نسلی مسئلے کی سب سے بڑی دقت یہ ہے کہ انگلستان وغیرہ کی طرح وہاں کے یہودی جرمن قوم میں نہیں سما سکے۔ انگلستان کے یہودیوں میں قوم پرست انگریزوں ہی کی سی ذہنیت پیدا ہو چکی ہے حقیقت تو یہ ہے کہ وہ انگریزی قوم میں پوری طرح جذب ہو چکے ہیں لیکن انگلستان اور جرمنی میں ایک فرق ہے۔ جرمنی مشرقی یہودیت (یعنی پولینڈ، آسٹریا اور ہنگری) اور مغربی یہودیت کے درمیان ایک درمیانی منزل کی حیثیت رکھتا ہے اس لئے جب اشتراکی جمہوری حکومت نے مشرقی ساحل کے دروازے کھول دیے تو جرمنی میں مشرقی یہودیت کا تلچھٹ باقی رہ گیا۔ بدقسمتی سے یہ لوگ بآسانی اس قوم میں جذب نہ ہو سکے جس نے اپنا دسترخوان ان کے لئے وسیع کیا وہ قومی زندگی میں ایک اجنبی عنصر بن کر رہتے ہیں اگرچہ مشرقی یہودی جرمن زبان اور جرمن رسوم و عادات اختیار کر چکے ہیں لیکن اُن کی ذہنیت اور ان کی تہذیب کبھی جرمن نہیں ہو سکی یہی وجہ ہے کہ وہ جرمنوں کے قول کے مطابق قوم کے خلاف تحریکات میں حصہ لینا شروع کر دیتے ہیں۔ ڈاکٹر گیبلز نے لکھا ہے کہ اشتراکی جمہوریت کی صیانت میں مشرقی یہودیوں نے اخبارات سنیما اور رائے عامہ کے ذریعے سے تباہ کن بدامنی پھیلا دی ہے۔ یہ سب اُس آزادی کا نتیجہ ہے جو یہودیوں کو جرمنی میں حاصل تھی اگر تم یہودیوں کی پیدا کی ہوئی خرابیوں پر نظر ڈالو اور اس کے بعد قومی زندگی میں ان کی روز افزوں تعداد کو دیکھو اور ساتھ ہی یہ مشاہدہ بھی کرو کہ ملکی اداروں اور مناصب پر اپنی آبادی کے تناسب سے کس قدر زیادہ یہودی قابض ہیں تو تم یہودیوں سے جرمنی کی موجودہ نفرت کی وجوہ بآسانی سمجھ جاؤ گے۔ صورتِ حال کو اس بات نے اور بھی خراب کر دیا ہے کہ یہودی اپنے آپ کو دوسری آبادی سے الگ تھلگ رکھتے ہیں مثلاً برلن کے متمول یہودی تاجر کرفرسٹن ڈم میں رہتے ہیں اور یہودیوں کا مقابلتاً غریب حصہ گرینیڈ برسٹراس میں مقیم ہے۔ یہ حصے خالص یہودی آبادی کے لئے مخصوص ہیں۔

جرمنی کے خلاف معاندانہ تحریکات

جرمنوں کے خیال کے مطابق عموماً انہی حصوں میں کمیونسٹ تحریک کے علمی اور عملی نظامات ترتیب پاتے تھے۔ یہودیوں کے ان غیر جرمن رجحانات نے قدرۃً لوگوں کے جذبات ان کے خلاف بھڑکا دیئے۔ انہی جذبات کو حکومت نے مناسب طریقے سے قانون کا جامہ

پہنایا اور مزید خطرات کی روک تھام کے لئے ایک خاص تناسب مقرر کر دیا جس سے زیادہ ملازمتیں قانونی اور طبی ادارات میں یہودیوں کو نہ مل سکتی تھیں ۔ جرمنوں کے اس خلافِ یہودیت طرزِ عمل سے ناراض ہو کر یہودیوں نے جرمنی کے خلاف سلطنت سے باہر تحریر و تقریر کا جہاد شروع کر دیا ۔ جب جرمنوں کو ٹھیک طور پر معلوم ہو گیا کہ اس جہاد کی کل جرمن یہودیوں ہی کے ہاتھ میں ہے ۔ جن میں وہ لڈوگ آئن شائن اور فوش وغیرہ جیسے لوگوں کا نام لیتے ہیں تو اُن کو اپنی حفاظت کے لئے عملی تدابیر اختیار کرنی پڑیں نتیجہ یہ ہوا کہ یہودیوں کا عام مقاطعہ شروع ہو گیا ۔ اگر حکومت خود دخل دے کر اس نازک موقع پر مقاطعہ کو قانوناً تسلیم نہ کر لیتی اور اسے منظم راستوں پر ڈال نہ دیتی تو جرمنوں کے قول کے مطابق نفرت کے یہ جذبات بہت خوفناک نتائج پیدا کرتے ۔ حکومت نے اس تحریک کو اپنے ہاتھ میں لے کر عدیم النظیر تنظیم سے کام لیا ہے ۔ کہتے ہیں کہ جرمن قوم اب اس تحریک کو ملتوی کرنے کے لئے تیار ہے ۔ بشرطیکہ یہودی اس کو تنہا چھوڑ دیں ۔ اس پیچیدہ عقدے کو سمجھنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ اُس صورت حال کو پیشِ نظر رکھا جائے جو نازیوں کے برسرِ حکومت ہونے سے پہلے پیدا ہو گئی تھی اور پھر اس کا مقابلہ بعد کے واقعات سے کیا جائے ۔ اس کے علاوہ جو خطرناک حالات پہلی صورت میں پیدا ہونے والے تھے اُن کا مقابلہ حکومت کے طریقِ کار سے کیا جائے ۔

نازی اور دنیا کی رائے عامہ

جرمنی ایک انقلاب سے دوچار ہو رہا ہے یہ ایک ایسا انقلاب ہے جو کسی اور ملک میں برپا ہوتا تو بہت سی جانیں تلف ہو جاتیں لیکن جرمنی کا موجودہ انقلاب بہ حیثیت مجموعی خون کے دھبوں سے پاک رہا ہے ۔ اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ اس سیاسی بھونچال کے آغاز میں عوام کے جوش و ہیجان کی وجہ سے بعض زیادتیاں بھی ہوئیں لیکن اس سے بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ بہ حیثیت مجموعی یہ انقلاب پُرامن رہا ہے اگرچہ اب ریش کی حکومت اور صوبوں اور شہروں کے نظامِ حکومت میں نومبر ۱۹۱۸ء سے بھی زیادہ تغیر و تبدل ہوا ہے لیکن لوگوں نے اس کا نہایت پُرجوش خیر مقدم کیا ہے ۔ اس خیر مقدم کا سبب یہ ہے کہ جرمن قوم جمہوریت کو زیادہ پسند نہ کرتی تھی گو اس کے ماتحت جرمنوں نے حیرت انگیز سرعت کے ساتھ اپنی حالت درست کر لی جمہوریت کو ناپسند کرنے کی وجہ یہ تھی کہ جرمن اسے عہد نامہ ورسائی کا نتیجہ قرار دیتے تھے خود ہیٹلر کی کامیابی کا ایک راز جرمن قوم کی یہ خواہش قرار دی جا سکتی ہے کہ وہ عہد نامہ ورسائی کی بیڑیوں سے جلد از جلد رہا ہو جانا چاہتی تھی اور اب جب کہ یہ قوم ایک نئی پیدائش کا درد برداشت کر رہی ہے یہ قدرتی بات ہے کہ وہ غیر مصلح عناصر کے خلاف سخت سے سخت تدابیر اختیار کرے ۔ یہودیوں کے خلاف یہ تحریک جرمنوں کی قومی نشاۃ الثانیہ کا ایک جزو لاینفک ہے ۔

بہر حال یہ بہت افسوسناک بات ہے کہ جرمنوں جیسی مہذب قوم کی نشاۃ الثانیہ کا نسلی منافرت سے اس قدر گہرا تعلق ہو جرمنوں کی سخت سے سخت مجبوری کے باوجود اُن کے نام پر ان افعال کی وجہ سے دیر تک ایک بدنما دھبا رہے گا لیکن جب ایک نئی حکومت کی تشکیل معرضِ عمل میں ہو اُس کے افعال کو ہدفِ تنقید بنانا زیبِ دانش نہیں ہمیں امید ہے کہ دنیا کی رائے عامہ ہٹلر کے افعال پر ٹھنڈے

دل سے غور کرے گی۔ اگر آخرکار وہ یہودیوں کے خلاف حکومت کی روش بدلنے میں کامیاب ہوگیا تو دنیا اس بات کو بھول جائے گی کہ اُس نے سیاسی طاقت حاصل کرنے کے لیے جرمنی کے خلافِ یہودیت جذبات سے فائدہ اٹھایا تھا۔ دنیا کی نظریں اس وقت ہٹلر کے طرزِعمل پر ہیں اور اگر برلن کی حکومت قانونی اور اقتصادی معاملات میں اپنی خلافِ یہود حکمتِ عملی کی حامی رہی تو جرمنی بین الاقوامی تعلقات کے اعتبار سے گھاٹے میں رہے گا۔ یہ بات نہ صرف اس لئے یقینی ہے کہ دنیا میں یہودی سرمائے کو زبردست طاقت حاصل ہے بلکہ اس لئے بھی کہ دنیا کی تمام جمہوری حکومتوں نے جرمنی کی اس یہود آزار حکمتِ عملی کو بیسویں صدی عیسوی کی تہذیب کے منافی قرار دیا ہے جرمنوں کی اس روش کے خلاف دنیا کی رائے عامہ نے حال ہی میں جو احتجاج کیا ہے اُس پر عہدِ حاضر کی انسانیت بجا طور پر ناز کر سکتی ہے ؀

حامد علی خاں

حقیقتِ حُسن

شیلے نے اپنی نظم "سکائی لارک" ۱۸۲۰ء میں لیگھارن کے مقام پر لکھی تھی۔ ۱۸۸۷ء میں ہارڈی بھی حسنِ اتفاق سے اسی مقام پر ٹھہرا۔ چنانچہ اُس نے اسی ماحول میں شیلے کی غیرفانی نظم سے متاثر ہوکر ذیل کی نظم تحریر کی۔ اس نظم میں یہ حقیقت نہایت حُسن وخوبی سے ظاہر کی گئی ہے کہ حسین چیز اگرچہ فنا ہوجاتی ہے مگر اس کے حُسن کو کبھی زوال نہیں ہوتا۔ حسن متواتر دیگر دلفریب صورتوں میں نمایاں ہوتا رہتا ہے ـــــــ مترجم

زمین کی فراموش کر دینے والی آغوش میں کہیں ایک مٹھی بھر خاک ـــ غیرمرئی اور غیرمحفوظ ـــ پڑی ہوئی ہے جس نے ایک شاعر کے تخیلات کو مرتعش کیا تھا! وہ خاک اُس سکائی لارک کی ہے جس کا وجد آفریں نغمہ شیلے نے سنا اور جس کو اس نے زندۂ جاوید کر دیا۔ اگرچہ اس پرندے نے عام پرندوں کی طرح زندگی کے دن گزارے اور اگرچہ وہ اس حقیقت سے بالکل ناآشنا رہا کہ وہ لازوال کر دیا گیا ہے اُس نے نہایت سادہ اور قناعت کی زندگی گزاری اور بالآخر زمین پر گر پڑا ـــ پوست واستخواں کا ایک ڈھیر ـــ وہ کس طرح مرا کس طرح اس نے اپنا وداعی نغمہ گایا، اور اس کی خاکستر کس جگہ بکھری پڑی ہے ـــ یہ تمام چیزیں نامعلوم ہیں۔

شاید اُس کی خاک سامنے والی زرخیز زمین پر پڑی ہو ـــ یا سبز عشق پیچہ میں متشکل ہو ـــ یا سامنے کی پرثمر انگور کی بیل کے دلفریب رنگ میں منوّر ہو! جاؤ ـــ اے پریو! ـــ جاؤ اور ڈھونڈ نکالو اُس بیش قیمت مٹھی بھر خاک کو۔ اور اسے ایک سیمیں ڈبیا میں بھر لو جو سونے اور جواہرات سے مرصع ہو! ہم اسے تبرک کے طور پر محفوظ رکھیں گے ـــ ایک لامحدود وقت تک ـــ کیونکہ یہ اُس پرندے کی خاک ہے جس نے ایک عظیم الشان شاعر کے تخیل کو رفعتِ پرواز بخشی تھی۔

عبدالغفور طاہر قریشی

بادل

مختلف الوان میں دھندلاہٹوں کا امتزاج
کوہساروں پر تخیّل زاد رعنائی کا راج

موجِ کیف و رنگ میں رومان سی اٹکے ہوئے
جس طرح پریوں کے آنچل خواب میں جھٹکے ہوئے

مستیاں اور مستیوں میں عالمِ کیف و جنوں
بادلوں کی خواب گوں دھندلی ضیاؤں کا فسوں

دلنشیں گیتوں کی اک سیّال رو محوِ خرام
بیخودی کے روپ میں موسیقیوں کا حسن نام

ابر بن کر ایک میگوں راگنی چھائی ہوئی
سب فضا اِک گیت کے مانند لہرائی ہوئی

جھاگ کے مینار قائم رفعتوں کے دوش پر
یا سمندر کے تموّج کا سماں پیشِ نظر

خود بہ خود رنگوں کا اک شہ کار سا بنتا ہوا
بادلوں کا پردۂ زر تار سا بنتا ہوا

اک دھواں سا جس سی کیا کیا صورتیں بنتی ہوئیں
کیف و مستی کی روپہلی مورتیں بنتی ہوئیں

آسماں اِک نیلگوں پردہ ہے جس پر دم بہ دم
صرفِ گلکاری ہے نقاشِ ازل کا موقلم

عدمؔ

غالب ۔ ریختے کے تمہیں استاد نہیں ہو غالب
کہتے ہیں اگلے زمانہ میں کوئی میر بھی تھا

ذوق ۔ نہ ہوا پر نہ ہوا میر کا انداز نصیب
ذوق یاروں نے بہت زور غزل میں مارا

سودا ۔ سودا تو اس زمیں میں غزل در غزل ہی لکھ
ہونا ہے تجھ کو میر سے استاد کی طرف

اثر ۔ بیشک کوئی ولی تھا اثر میر نکتہ سنج
سب شاعروں سے خاص ہے اس با خدا کا رنگ

رند ۔ تیرا کلام کتنا مشابہ ہے میر سے
عاشق ہیں ہم تو رند اسی بول چال کے

شیفتہ ۔ نرالی سب سے ہے اپنی روش اے شیفتہ لیکن
کبھی دل میں ہوائے شیوہائے میر پھرتی ہے

حالی ۔ حالی سخن میں شیفتہ سے مستفید ہے ،
غالب کا معتقد ہے مقلد ہے میر کا

جلال ۔ کہنے کو جلال آپ بھی کہتے ہیں وہی طرز
لیکن سخنِ میر تقی میر کی کیا بات !

مصحفی ۔ اے مصحفی تو اور کہاں شعر کا دعوےٰ
پھبتا ہے یہ اندازِ سخن میر کے اوپر

دریافت طلب امر یہ ہے کہ میر کے کلام میں وہ کون سی بات ہے جس نے اُسے "خدائے سخن" بنا دیا۔

ذوق کے نزدیک وہ چیز "انداز" ہے جو بہت کم لوگوں کو نصیب ہوا اور اس میں شک نہیں کہ "اندازِ بیان" یا "اسلوبِ بیان" ہی وہ چیز ہے جو سننے والے کو تڑپا دیتی ہے اور نظم کو نثر سے ممتاز کرتی ہے۔ انداز کی کئی صورتیں ہیں "غالب کا اندازِ بیاں" "اور" ہے۔ میر کا اندازِ بیاں اور ہے۔ اسی اندازِ بیان میں اختلاف کی وجہ سے غالب کے بیشتر اشعار پڑھ کر انسان "فرہنگ انجمن آرا" یا "شرح اشارات" کی طرف مائل ہوتا ہے لیکن میر کے بیشتر اشعار پڑھ کر بے اختیار سر دھننے لگتا ہے۔

غالب کے یہاں دقت پسندی، فارسی تراکیب، اور نازک خیالی، مضمون آفرینی وغیرہ سے کام لیا گیا ہے اور انہی کے مجموعہ کا نام غالب کا اندازِ بیان ہے۔ میر کے یہاں سوز و گداز اور درد و غم کارفرما ہیں اور انہی کے اظہار کا نام میر کا اندازِ بیان ہے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ جو شے میر کے کلام کو جملہ شعرا کے کلام سے ممتاز کرتی ہے وہ یہی سوز و گداز ہے جو بقول شبلی شاعری اور علی الخصوص غزل سرائی کی جان ہے۔

ذوق اس لئے شعر کہتے ہیں کہ انہیں ایک محاورہ باندھ کر دکھانا ہے۔ کبھی "روزمرہ" کو خوبصورتی کے ساتھ مصرعہ میں کھپا کر داد لینی ہے کبھی سنگلاخ زمین کو پامال کرنا ہے غیر مانوس قوافی استعمال کر کے فریقِ ثانی پر اپنی شاعری کا سکہ جمانا ہے کبھی صنعتِ شعری کا اظہار مقصود ہے، ناصحانہ رنگ اختیار کر کے سعدی کا ہمرنگ بننا منظور ہے، بادشاہِ وقت کا تقرب مدِ نظر ہے۔ یا غالب بیچارے کو یہ دکھانا ہے کہ "دیکھو سخنور لوگ اس طرح سہرا کہتے ہیں"۔ یا دو غزلہ کہنا ہے لہٰذا مجبور ہیں کہ شعر پر شعر کہے جائیں۔ لیکن میر اس لئے شعر کہتا ہے کہ "جذبۂ دل" اُسے شعر کہنے پر مجبور کرتا ہے۔ میر اُس وقت بھی شعر کہتا اگر کوئی سننے والا

نہ ہوتا، لیکن ناسخ، انشا، وزیر وغیرہ کی شاعری مشاعروں اور درباروں کی "واہ! وا" اور "سبحان اللہ" کے سہارے قائم تھی انھوں نے ہنگامہ گرم کرنے کے لئے شاعری کے کوچہ میں قدم رکھا، میرؔ نے وارداتِ قلبی کے بیان کرنے کی خاطر شعر کہا:-

کیا تھا شعر کو پردہ سخن کا :: وہی آخر کو ٹھہرا فن ہمارا

یہ لوگ "زبان" کو مانجھتے تھے۔ "میرؔ سوز دروں کا اظہار کرتا تھا۔ اُن کے لئے شاعری ذریعۂ افتخار تھی، میرؔ کے لئے مشغلۂ حیات تھی۔ یہ لوگ شاعر تھے، میرؔ صاحب درد و غم تھا:-

ہم کو شاعر نہ کہو میرؔ کہ صاحب ہم نے
درد و غم کتنے کئے جمع تو دیوان کیا

میرؔ ازل ہی سے دردمند دل لے کر آئے تھے، ان کو دنیا میں سوائے رنج و الم کے اور کچھ دکھائی نہ دیتا تھا، چنانچہ خود لکھتے ہیں:-

نہ دردمندی سے یہ راہ تم چلے ورنہ،
قدم قدم پہ تھی یاں جائے نالہ و فریاد

اس کی وجہ یہ ہے کہ آنکھ کھول کر مصیبت ہی مصیبت دیکھی، دس سال کی عمر میں باپ کا انتقال ہوا، بڑے بھائی نے برادرانِ یوسفی کا سا برتاؤ کیا، عنفوانِ شباب ہی میں مجبوراً تلاشِ معاش کے لئے نکل کھڑے ہوئے۔ دلی میں جب تک رہے تکالیف ہی کا سامنا رہا، خان آرزو نے بھی اچھا سلوک نہ کیا۔ روزی کا مستقل ٹھکانا نہ تھا آج گھر میں اناج، تو کل نانِ شبینہ کو محتاج

بعض اوقات فاقہ کی نوبت پہنچ جاتی تھی۔ کلام میں بھی اس کی جھلک موجود ہے:-

نامرادانہ زیست کرتا تھا
میرؔ کی وضع یاد ہے ہم کو
بہت سعی کیجے تو مر رہیئے میرؔ
بس اپنا تو اتنا ہی مقدور ہے

پھر دلی کی بربادی، اقربا اور شرفا کی تباہی، آئے دن کے انقلاب، مرہٹوں اور جاٹوں کی دستبرد، یہ سب نقشہ اپنی آنکھوں سے دیکھا اور قلم سے لکھا:-

دلی میں آج بھیک بھی ملتی نہیں انہیں
تھا کل تلک دماغ جنہیں تاج و تخت کا

(ماخوذ از تاریخ ادب اردو)

اس پر طرہ یہ ہوا کہ اُن کے دل پر ابتدا ہی سے عشق کا چرکا لگ چکا تھا اور عمر بھر یہ زخم مندمل نہ ہوا اگرچہ یہ ایک ایسا راز ہے کہ عام طور پر مشہور نہیں لیکن صاحب "بہار بے خزاں" نے اس کو فاش کر دیا ہے:-

"بشہر خویش با پری تمثالے کہ از عزیزانش بود در پردۂ تعشق طبع و میل خاطر داشت۔ آخر عشق او خاصہ مشک پیدا کردہ میخواست کہ بخیہ بچار سوئے رسوائی می کند وحسن بے پردہ بجلوہ گری در آید از ننگ افشائے راز وطن اقربا بادلے لبغل پر وردۂ حسرت و حرماں و با خاطر ناشاد دست و گریباں قطع رشتۂ حب وطن ساختہ از اکبرآباد بعد از خانہ برانداز یہا بشہر لکھنو رسید

وہمیں جا بصد حسرت جانکاہِ جلا وطنی و حرماں نصیبی

از دیدار یار و دیار' جاں بجہاں آفریں داد' تا بقید

رشتۂ حیات بود طوق محبت بگردن و سلسلۂ دیوانگی

بپا داشت از کلام عاشقانہ و درد انگیزش پیدا است

کہ صد آرزو بخاک بُردہ۔"

میر صاحب کے بعض اشعار سے بھی در پردہ اُس کی تصدیق

ہوتی ہے چنانچہ وہ فرماتے ہیں :-

مرے سلیقہ سے میری نبھی محبت میں

تمام عمر میں ناکامیوں سے کام لیا

ان کے بعض اشعار سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ انہوں نے

فنِ شعر کو انہی عاشقانہ جذبات کے اظہار کے لئے اختیار کیا

تھا جو رفتہ رفتہ ان کا مستقل مشغلہ حیات بن گیا :-

کیا تھا شعر کو پردہ سخن کا

وہی آخر کو ٹھہرا فن ہمارا (شعر الہند حصہ اول)

میر صاحب کے سوز و گداز کی اصلی وجہ یہی ہے کہ ایک

طبیعت ہی دردمند پائی تھی اوپر سے عشق کا چرکا لگ گیا گویا

بقول میر "سمند ناز پہ اک اور تازیانہ ہُوا۔"

اگر میر کے دواوین کو اس زاویۂ نگاہ سے دیکھا جائے

تو معلوم ہو سکتا ہے کہ عشق و عاشقی میں' ایک انسان کے دل پر

جو حالتیں گزر سکتی ہیں وہ سب' اشعار کے پردہ میں بیان کر دی

گئی ہیں۔ ان اشعار سے ہر سمجھدار آدمی' عاشقوں کی زندگی کا

نفسیاتی مطالعہ بآسانی کر سکتا ہے۔

میر نے دل لگا کر کبھی سکھ نہ پایا' کسی گھڑی راحت نظر

نہ آئی' زندگی برباد ہو گئی :-

لگا نہ دل کو کہیں کیا سنا نہیں تو نے

جو کچھ کہ میر کا اس عاشقی نے حال کیا

اگرچہ فراقِ یار ہی میں عمر بسر ہو گئی لیکن' راز افشا نہیں

کیا' اللہ رے سمائی! یہاں تو یہ کیفیت ہے کہ جب تک حال

دل احباب سے بیان نہیں کر لیتے چین نہیں پڑتا۔

مرے سلیقہ سے میری نبھی محبت میں

تمام عمر میں ناکامیوں سے کام لیا

میر اس دنیا سے "نامراد" گئے :-

نامرادی کی رسم میر سے ہے

طور یہ اس جوان سے نکلا

میر کو اپنے محبوب کی لگن لگی رہتی تھی لیکن

جانتے تھے کہ ہر دم یاد کرنے سے اس کا خیال اس طرح

رگ و پے میں سما جائیگا کہ پھر بھلانا امکان سے باہر ہو جائیگا۔

یاد اُس کی اتنی خوب نہیں میر باز آ

نادان پھر وہ جی سے بھلایا نہ جائیگا

تنگ آکر میر بانیٔ رسمِ عاشقی کو بد دعا دینے لگتے ہیں

اور یہ بالکل انسانی فطرت کے مطابق ہے :-

سخت کافر تھا جس نے پہلے میر

مذہبِ عشق اختیار کیا

ہوش سنبھالتے ہی میر کسی کی زلف پیچاں کے اسیر ہو گئے

تھے اور بقیہ عمر اسی اضطراب میں گزری :-

نمود کرکے وہیں بحرِ غم میں بیٹھ گیا ؛ کہے تو میر بھی اک بلبلہ تھا پانی کا

دل دینے کے بعد اک طرفہ مصیبت کا سامنا ہوتا ہے بلکہ نئی مصیبت پڑتی ہے انسان چونکہ اس آفت سے خبردار نہیں ہوتا لہذا بہت گھبراتا ہے، لیکن آگے چل کر پھر آفتیں نہیں آتیں بلکہ پہاڑ ٹوٹ پڑتے ہیں:-

ابتدائے عشق ہے روتا ہے کیا
آگے آگے دیکھیو ہوتا ہے کیا

عاشق کی کوئی مراد پوری نہیں ہوتی اور اگر کسی کی ہوئی بھی ہو تو کم از کم میر کی نہیں ہوئی:-

سبز ہوتی ہی نہیں یہ سرزمیں
تخمِ خواہش دل میں تو بوتا ہے کیا

میر کی روتے ہی گزرتی تھی:-

مجھے کام رونے سے اکثر ہے ناصح
تو کب تک مرے منہ کو دھوتا رہے گا

عاشق اگر مسجد یا مندر میں جاتا ہے تو وہاں بھی خیالِ محبوب سے غافل نہیں ہوتا:-

طوفِ حرم میں بھی میں بھولا نہ تجھ کو اے بت
آتا تھا یاد تو ہی میرا خدا ہے شاہد

عاشق کی نظر میں "موت" محبت کو ختم نہیں کر سکتی:-

مرگ اک ماندگی کا وقفہ ہے
یعنی آگے چلیں گے دم لے کر

میر حسرتِ دیدار اپنے ساتھ قبر میں لے گئے کیونکہ خواہشِ دید کا اظہار افشائے راز کا موجب تھا:-

موا جس کے لئے اُس کو نہ دیکھا، نہ سمجھے میر کا کچھ مدعا ہم

عاشق پہلے تو آرزوئے وصال میں جینے کا خواہشمند ہوتا ہے لیکن جب ایک مدت تک پے در پے صدمے اٹھاتا ہے تو کہتا ہے کہ دل لگاتے ہی مرجاتا تو اچھا تھا۔

ہوتا نہ دل کا تا یہ سرانجام عشق میں
لگتے ہی جی کے مر گئے ہوتے بلا سے ہم

تھوڑی دیر رونے سے بجائے سکون ہونے کے اور اضطراب ہوتا ہے، عاشق چاہتا ہے کہ خوب روئے تاکہ دل کی بھڑاس نکل جائے اور یہ بالکل قدرتی بات ہے:-

متصل روتے ہی رہیئے تو بجھے آتشِ دل
ایک دو آنسو تو اور آگ لگا جاتے ہیں

محبت میں سمجھانا غضب ہے، جس قدر روکو، اسی قدر اُس طرف جانے کو دل ہوتا ہے۔

کہنے سے میرے اور بھی ہوتا ہے مضطرب
سمجھاؤں کب تک اس دلِ خانہ خراب کو

کچھ عرصہ تک روتے رہنے یا اس کی یاد میں تڑپنے یا خیال میں باتیں کرتے رہنے سے عاشق اس طرزِ زندگی کا خوگر ہو جاتا ہے اور سوال یہ ہے کہ اگر عاشق، ان باتوں پر عمل نہ کرے تو اور کیا کرے اُسے دنیا کی باتوں سے تو دلچسپی باقی رہتی ہی نہیں۔

کڑھیئے نہ روئیے تو اوقات کیونکہ گزرے
رہتا ہے مشغلہ سا بارے غم و الم سے

انسان بالطبع جویائے راحت ہے مسلسل صدمے اور پیہم تکالیف برداشت کرنے کے بعد کہیں جا کر دل جفائے یار

کا خوگر ہوتا ہے :۔

کیا کیا تعب اٹھائے کیا کیا عذاب کھینچے
تب دل ہوا ہے اتنا خوگر ترے ستم سے

کبھی کبھی عشق میں چُپ لگ جاتی ہے انسان ہفتوں کسی سے بات نہیں کرتا اور نہ کرنا چاہتا ہے :۔

نہ شکوہ شکایت نہ حرف و حکایت
کہو میرؔ جی آج کیوں ہو خفا سے ؟

عاشقِ مہجور کو دیکھ کر قدرتی طور پر دل بھر آتا ہے اور انسان اس کے لئے کڑھنے لگتا ہے :۔

میرؔ صاحب رُلا گئے سب کو
کل وہ تشریف یاں بھی لائے تھے

فرقت کی حالت میں عاشق کے سامنے اگر کوئی شخص محبوب کا نام لیتا ہے تو سنتے ہی تڑپ جاتا ہے اور اس کی یاد دل میں چٹکیاں لینے لگتی ہے بے اختیار آنکھوں سے آنسو رواں ہو جاتے ہیں اور یہ بالکل قدرتی بات ہے :۔

کٹے ہے دیکھئے یوں عمر کب تلک اپنی
کہ سنیئے نام ترا اور چشم تر کریئے

میرؔ کے اشعار اور اُن کے "انداز بیان" سے وہی شخص بہرہ اندوز ہو سکتا ہے جو اُن کا سا کمال رکھتا ہو یعنی صاحبِ ذوقِ سلیم ہو اور اُس کا دل بھی چوٹ کھایا ہوا ہو۔

سمجھے اندازِ شعر کو میرے
میرؔ کا سا اگر کمال رکھے

میرؔ نے وصالِ یار کی بہت کوشش کی لیکن کبھی کامیابی کا امکان بھی پیدا نہ ہُوا :۔

بہت سعی کیجے تو مر رہیئے میرؔ
بس اپنا تو اتنا ہی مقدور ہے

انسان جب بہت آشفتہ حال اور سرگشتہ ہو جاتا ہے جب مدتوں تک موردِ آفات و مصائب رہتا ہے تو کبھی کبھی گھبرا کر کہہ اٹھتا ہے ۔

پژمردہ اس قدر ہیں کہ ہے شبہ ہم کو میرؔ
تن میں ہمارے جان کبھی تھی بھی یا نہ تھی

اگرچہ عاشق کو تکلیف ہی کیوں نہ پہنچے لیکن وہ گوارا نہیں کر سکتا کہ اس کی راحت میں کوئی پہلو ایسا نکل آئے جس سے اغیار کو محبوب سے قُرب نصیب ہو جائے ۔

ہنگامہ میری نعش پہ تیری گلی میں ہے ۔
لے جائیں گے جنازہ کشاں یاں سے کب مجھے[1]

عاشق حد درجہ شکّی ہوتا ہے وہ اپنے معشوق کو خدا کے سپرد بھی نہیں کرنا چاہتا کسی نے کیا خوب کہا ہے عشق است و ہزار بدگمانی ۔

غیروں کا ساتھ موجبِ صد وہم ہے بُتاں!
اس باب میں خدا بھی کہے تو نہ مانیئے[2]

عاشق مرنے سے جان نہیں چراتا لیکن آرزوئے وصل اُسے زندہ رہنے پر مجبور کرتی ہے وہ کہتا ہے شاید کل وصل نصیب ہو جائے۔

اسی آرزوئے وصل نے مشکل کیا مرنا مرا
ورنہ گزرنا جان سے اتنا نہیں دشوار ہے

---

[1] یہ شعر بھی اسی رنگ کا ہے :۔ اپنی گلی میں دفن نہ کر مجھ کو بعد قتل ؛ میرے پتے سے غیر کو کیوں تیرا گھر ملے ۔
[2] غالب کہتے ہیں :۔ قیامت ہے کہ ہوئے مدعی کا ہمسفر غالب ؛ وہ کافر جو خدا کو بھی نہ سونپا جائے ہے مجھ سے

میں نے صرف ایک دیوان سے اس قدر اشعار سرسری طور پر پیش کر دیئے، اگر تفحص کیا جائے تو ایک مستقل مضمون اس عنوان پر لکھا جا سکتا ہے۔

میر نے اپنے اشعار میں تمامتر اپنے سوز دروں کا اظہار کیا ہے:-

جہاں سے دیکھئے ایک شعرِ شور انگیز نکلے ہے
قیامت کا سا ہنگامہ ہے ہر جا میرے دیوان میں

میر نے اپنا جگر خون کر کے اشعار کہے ہیں:-

مصرع کوئی کوئی کبھی موزوں کروں ہوں میں
کس خوش سلیقگی سے جگر خوں کروں ہوں میں

آگرہ سے دلی گئے، اور دلی سے لکھنؤ گئے لیکن "اداسی" ہر جگہ ساتھ رہی۔

لکھنؤ، دلی سے آیا یاں بھی رہتا ہے اداس
میر کو سرگشتگی نے بے دل و حیران کیا

میر نے جوانی میں کوئی ایسا کاری صدمہ اٹھایا تھا کہ مرتے دم تک اس کا اثر زائل نہ ہو سکا:-

کچھ رنج دلی میر جوانی میں کھنچا تھا
زردی نہیں جاتی مرے رخسار سے اب تک

میر کی زندگی ہی میں اُن کے اشعار کی قدر ہو گئی تھی، لوگ ان میں سے اپنی پسند کے موافق انتخاب کر لیا کرتے تھے اور یہ ظاہر ہے کہ انتخاب اُسی شاعر کے کلام میں سے کیا جاتا ہے جس کے اشعار دلپذیر ہوں:-

اشعار میر سب نے چن چن کے لکھ لئے ہیں
رکھیں گے یاد ہم بھی کچھ بیتیں چیدہ چیدہ

میر کے کلام کی شہرت اُن کی زندگی ہی میں ہو گئی تھی:-

دکھن، اتر، پورب پچھم ہنگامہ ہے سب جاگہ
اُدھم میرے حرف و سخن نے چاروں اُور مچایا ہے

میر کو اپنے کلام کے پُر تاثیر ہونے کا یقین تھا کیونکہ "آنچہ از دل می خیزد بر دل می ریزد":-

باتیں ہماری یاد رہیں پھر باتیں ایسی نہ سنیئے گا
پڑھتے کسو کو سنیئے گا تو دیر تلک سر دھنیئے گا

صدمۂ ہجر نے میر کو "بے دماغ" اور رنجور بنا دیا تھا اور نازاٹھانے کی طاقت نہیں رہی تھی:-

گل نے بہت کہا کہ چمن سے نہ جائیے
گلگشت کو جو آیئے آنکھوں پہ آیئے
میں بے دماغ کر کے تغافل چلا گیا
وہ دل کہاں کہ ناز کسو کے اُٹھایئے

مریضِ عشق اچھا نہیں ہوتا۔ یہ وہ مرض ہے کہ دمہ کی طرح دم کے ساتھ جاتا ہے:-

اچھا ہوتا نہیں مریضِ عشق
ساتھ جی کے ہے دل کی بیماری

لکھنؤ والوں نے اُن کے کلام کی قدر جیسی وہ چاہتے تھے نہیں کی:-

مربوط کیسے کیسے کئے ریختے ولے
سمجھا نہ کوئی میری زبان اس دیار میں

ذیل میں چند اشعار ایسے نقل کئے جاتے ہیں جن سے میر کا انداز بیان بخوبی ظاہر ہو سکے گا:-

میرے منہ پہ رکھا ہے رنگ اب تلک
ہزار آفریں چشمِ خونبار کو

عشق میں ہم نے جان کہنی کی ہے
کیا محبت نے دشمنی کی ہے،

لوگوں نے پائی خاک کی ڈھیری مری جگہ
اک شعلہ میرے دل سے اٹھا تھا جلا گیا

کافر کا بھی رویہ ہوتا نہیں ہے ایسا
ٹھوکر لگا کے چلنا کس دین میں روا ہے؟

دیکھیں کب تک رہے ہے یہ صحبت
گالیاں کھائیے دعا کریئے

اجڑے نگر کو دل کے دیکھیوں ہوں جب کہوں ہوں
اب پھر بسے گی ایسی بستی خراب کیونکر ؟

شہر میں گھر خراب ہے اتنا،
آتے ہیں یاں اب اس نشاں سے لوگ

مبارک تمہیں میر ہو عشق کرنا،
بہت ہم تو پچھتائے دل کو لگا کر

وفا لوگ آپس میں کرتے تھے آگے
یہ رسمِ کہن آہ تم نے اٹھا دی

رہتی ہو نم آنکھوں میں پھرتے ہو تمہیں دل میں
مدت سے اگرچہ یاں آتے ہو نہ جاتے ہو

بلبل کو مُوا پایا کل پھولوں کی دُکاں پر
اُس مرغ کے بھی جی میں کیا شوقِ چمن کا تھا؟

وہ دن گئے کہ اُٹھ کر جاتے تھے اُس گلی میں
اب سعی چاہیئے ہے بالیں سے سر اُٹھاتے

آگ تھے ابتدائے عشق میں ہم،
اب جو ہیں خاک انتہا ہے یہ

ایک سب آگ ایک سب پانی
دیدہ و دل عذاب ہیں دونوں،

منصور کی حقیقت تم نے سُنی ہی ہوگی
جو حق کہے ہے اُس کو یاں دار کھنچتے ہیں

جنوں تیری منت ہے مجھ پہ کہ تو نے
نہ رکھا میرے سر پہ بارِ گریباں

مقصود کو تو دیکھیں کب تک پہنچتے ہیں ہم
بالفعل اب ارادہ تا گور ہے ہمارا

برکیف اب ہم اُن کے بہتر نشتر اپنی پسند کے موافق ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں :-

(۱) ہر ذرہ خاک تیری گلی کا ہے بیقرار
یاں کون سا ستم زدہ ماٹی میں مل گیا؟

(۲) یک قطرہ خون ہو کے پلک سے ٹپک پڑا
قصہ یہ کچھ ہوا دلِ غفراں پناہ کا

(۳) دل کی ویرانی کا کیا مذکور ہے،
یہ نگر سو مرتبہ لوٹا گیا

(۴) پوشیدہ رازِ عشق چلا جائے تھا سو آج
بے طاقتی نے دل کی وہ پردہ اٹھا دیا

(۵) دل وہ نگر نہیں کہ پھر آباد ہو سکے،
پچھتاؤگے سنو ہو یہ بستی اُجاڑ کر

(۶) دمِ آخر ہے، بیٹھ جا، مت جا،
صبر کر ٹک کہ ہم بھی چلتے ہیں

(۷) متصل روتے ہی رہیئے تو بجھے آتشِ دل
ایک دو آنسو تو اور آگ لگا جاتے ہیں

(۸) عشق کیا کیا ہمیں دکھاتا ہے،
آہ تم بھی تو اک نظر دیکھو

(۹) ہائے اس زخمیٔ شمشیرِ محبت کا جگر
درد کو اپنے جو ناچار چھپا رکھتا ہو

(۱۰) حسرتِ وصل وغمِ ہجر وخیالِ رخِ دوست
مر گیا میں پہ مرے جی میں رہا کیا کیا کچھ

(۱۱) یوں اٹھے آہ اس گلی سے ہم
جیسے کوئی جہاں سے اٹھتا ہے

(۱۲) نہ رکھی مری خاک بھی اس گلی میں
شکایت مجھے ہے نہایت صبا کی

(۱۳) سحر پائے گل بے خودی ہم کو آئی
کہ اس سست پیماں میں بو تھی کسی کی

(۱۴) اپنی خبر بھی ہم کو اب دیر پہنچتی ہے
کیا جانے یار اس کو کب تک خبر کریں گے،

(۱۵) شاید کہ خونِ دل کا پہنچا ہی وقت آخر
تھم جاتے ہیں کچھ آنسو راتوں کو آتے آتے

(۱۶) جب نام ترا لیجئے تب چشم بھر آوے
اس زندگی کرنے کو کہاں سے جگر آوے

(۱۷) آگے بھی ترے عشق سے کھینچے تھے درد وغم
لیکن ہماری جان پہ ایسی بلا نہ تھی

(۱۸) کہاں تک شب و روز آہ دردِ دل کہیئے
ہر ایک بات کی آخر کچھ انتہا بھی ہے

(۱۹) پہنچا تو ہوگا سمعِ مبارک میں حالِ میر
اس پر بھی جی میں آوے تو دل کو لگائیے

(۲۰) دکھائی دیئے یوں کہ بے خود کیا
ہمیں آپ سے بھی جدا کر چلے

(۲۱) چاک پر چاک ہوا جوں جوں سلایا ہم نے
اس گریباں ہی سے اب ہاتھ اٹھایا ہم نے

(۲۲) مصائب اور تھے، پر دل کا جانا،
عجب اک سانحہ سا ہو گیا ہے

(۲۳) تھی چشم دمِ آخر وہ دیکھنے آوے گا
سو آنکھوں میں دم آیا پر وہ نہ نظر آیا

(۲۴) روتے پھرتے ہیں ساری ساری رات
اب یہی روزگار ہے اپنا

(۲۵) شام سے کچھ بجھا سا رہتا ہے،
دل ہوا ہے چراغ مفلس کا

(۲۶) کہنے تو ہو یوں کہتے یوں کہتے جو وہ آتا
سب کہنے کی باتیں ہیں کچھ بھی نہ کہا جاتا

(۲۷) ہوئیں رسوائیاں جس کے لئے چھوٹا دیار اپنا
ہوا وہ بے مروت بے وفا ہرگز نہ یار اپنا

(۲۸) سب گئے، ہوش و تاب و صبر و تواں
دل سے اک داغ ہی جدا نہ ہوا

(۲۹) کس طرح جی سے گزر جاتے ہیں آنکھیں موند کر
دیدنی ہے دردمندوں کے بھی مرجانے کی طرح

(۳۰) جدائی کے حالات میں کیا کہوں
قیامت تھی اک ایک ساعت کے بعد

(۳۱) پوچھیں ہیں وجہِ گریۂ خونیں جو مجھ سے لوگ
کیا دیکھتے نہیں ہیں سب اُس ہونٹ کا رنگ

(۳۲) تربتِ میر پر چلے تم دیر،
اتنی مدت میں واں رہا کیا خاک

(۳۳) یہی جانا کہ کچھ نہ جانا ہائے،
سو بھی اک عمر میں ہوا معلوم

(۳۴) اب کی جنوں میں فاصلہ شاید نہ کچھ رہے
دامن کے چاک اور گریباں کے چاک میں

(۳۵) چمن میں جاکے بھر دو تم گلوں سے جیب و کنار
ہم اپنے دل ہی کے ٹکڑوں سے گل بداماں ہیں

(۳۶) پُرخوں ہمارے دل سی کتنی ہے تو مشابہ
شاید کلی تجھے بھی اُس گُل کی آرزو ہو

(۳۷) ہمیشہ چشم ہی نمناک ہاتھ دل پر ہے
خدا کسی کو نہ ہم سا بھی دردمند کرے

(۳۸) آغاز تو ہے یہ کچھ روتے ہیں خون ہر دم
کیا جانئے عاشقی کا یارو مآل کیا ہے

(۳۹) چھاتی جلا کرے ہے سوزِ دروں بلا ہے
اک آگ سی لگی ہے کیا جانئے کہ کیا ہے

(۴۰) ہم طورِ عشق سے تو واقف نہیں ہیں لیکن
سینہ میں جیسے کوئی دل کو ملا کرے ہے

(۴۱) کیا جانئے کہ عشق میں خوں ہو گیا کہ داغ
چھاتی میں اب تو دل کی جگہ ایک درد ہے

(۴۲) عشق آدم میں نہیں کچھ چھوڑتا،
ہَولے ہَولے کوئی کھا جاتا ہے جی

(۴۳) جو خواہش نہ ہوتی تو کاہش نہ ہوتی،
ہمیں جی سے مارا تری آرزو نے

(۴۴) پھر اس سال سے پھول سونگھا نہیں نے،
دیوانہ کیا تھا مجھے تیری بو نے

(۴۵) دیدنی ہے شکستگی دل کی،
کیا عمارت غموں نے ڈھائی ہے

(۴۶) عشق بھی ہم میں ہائے تصرف کیسے کیسے کرتا ہے
دل کو چاک جگر کو زخمی آنکھوں کو خونبار کیا

(۴۷) بکھرے رہتے ہوں ہر دم پھول ہی جس کے گریباں میں
وہ کیا جانے کہ ٹکڑے ہیں جگر کے میرے داماں میں

(۴۸) کیسی وفا و اُلفت کھاتے عبث ہو قسمیں
مدت ہوئی اٹھا دیں تم نے یہ ساری رسمیں

(۴۹) رہا تھا دیکھ اُدھر میر چلتے،
عجب اک ناامیدی تھی نظر میں

(۵۰) تصور اپنے ہی طولِ عمر کا تھا
نہ کی تقصیر اُس نے تو جفا میں

(۵۱) ہے دور ادب، تم کھڑے میں پاکشیدہ ہوں
مت آئیو جنازے کی میرے نماز کو،

(۵۲) پہلے دیوانے ہوئے پھر میر آخر ہو گئے،
ہم نہ کہتے تھے کہ صاحب عاشقی تم مت کرو

(۵۳) کڑھتے ہمیشہ رہنا ہم کو بغیر اُس کے،
کیا روگ عاشقی نے جی کو لگا دیا ہے

(۵۴) چپکے کچھ ہو جاتے ہو پھر آنکھیں بھر بھر لاتے ہو
میر گزرتی ہے کیا جی پر ؟ کڑھا کرو ہو اکثر تم

(۵۵) دل کی کچھ تقصیر نہیں ہے آنکھیں اُس سے لگ پڑیاں
مار رکھا سو اُن نے مجھ کو کس ظالم سے جا لڑیاں

(۵۶) ہم فقیروں کو کچھ آزار تمہیں دیتے ہو،
یوں تو اس فرقہ سے سب لوگ دعا لیتے ہیں

(۵۷) جانِ جہاں سے گزرا میں میرؔ جن کی خاطر
بچ کر نکلتے ہیں دے، میرے مزار سے بھی

(۵۸) دل کی نہیں بیماری ایسی، جس میں ہو امید کبھی،
کیا سنبھلے گا میرؔ ستمکش وہ تو مارا غم کا ہے

(۵۹) فرصت ہے کم رہنے کی یاں، بات نہیں کچھ کہنے کی
آنکھیں کھول کے کان جو کھولو بزمِ جہاں افسانہ ہے

(۶۰) خواہشِ دل سے جی کی تاب گئی،
آنکھیں اُس سے لگیں سو خواب گئی

(۶۱) اُسے ڈھونڈتے میرؔ کھوئے گئے
کوئی دیکھے اس جستجو کی طرف،

(۶۲) دیکھیں تھیں اک روز تری مست انکھڑیاں
انگڑائیاں ہی لیتے ہیں جب سے خمار میں

(۶۳) کافر کا بھی رویہ ہوتا نہیں ہے ایسا
ٹھوکر لگا کے چلنا کس دین میں روا ہے؟

(۶۴) تیرے بندے ہم ہیں، خدا جانتا ہے
خدا جانے تو ہم کو کیا جانتا ہے،

(۶۵) وہ بے وفا نہ آیا بالیں پہ وقتِ رفتن
سو بار ہم نے دیکھا سر کو اُٹھا اُٹھا کر

(۶۶) اس سے گھبرا کے جو کچھ کہنے چلا جاتا ہوں
دل کی پھر دل میں لئے چپکا چلا آتا ہوں

(۶۷) بے تابِ دل نہ دفن ہوا ے کاش میرے ساتھ
رہنے نہ دیگا نعش کو کوئی دن مزار میں

(۶۸) گھر کو اُس کے خراب ہی دیکھا
جس کے یہ چشم و دل مشیر ہوئے

(۶۹) لب پہ مرے آن کر بارہا پھر پھر گئی،
جان کو یہ اضطراب دیکھئے کب تک ہے

(۷۰) آنے کو وقت تم تو کہیں کے کہیں رہے
اب آئے تم تو فائدہ؟ ہم ہی نہیں رہے

(۷۱) وہ دن گئے کہ آٹھ پہر اُس کے پاس تھے
اب آ گئے تو دور سے کچھ غم سنا گئے

(۷۲) راہ آنسو کی کب تلک تکیئے؛
خون دل ہی کا اب مزہ چکھیئے

آخر میں میر صاحب کے سوانح حیات مختصر طور پر ایراد کئے دیتے ہیں:-

میر محمد تقی نام میرؔ تخلص، غالباً ۱۱۳۵ھ میں بمقام اکبر آباد (آگرہ) پیدا ہوئے۔ تذکروں میں والد کا نام میر عبداللہ لکھا ہے، مگر "ذکر میر" میں میر صاحب نے اُن کے نام کی تصریح نہیں کی، صرف اس قدر بیان کیا ہے کہ میرے والد نے جو میرے دادا کے چھوٹے بیٹے تھے، درویشی اختیار کی اور ترکِ دنیا کر کے بیٹھ رہے۔ شاہ کلیم اللہ اکبر آبادی سے علم ظاہری و باطنی حاصل کیا جوانِ صالح اور عاشق پیشہ تھے۔ علی متقی کے عرف سے مشہور ہوئے۔

میرؔ کے دادا اکبر آباد میں فوجداری کے عہدہ پر ممتاز

تھے۔ اور چونکہ خاندانی لحاظ سے سید تھے اس لئے شہر میں کافی عزت تھی۔ میر نے اسی عزو جاہ کی طرف اشارہ کیا ہی:۔

پھرتے ہیں میر خوار، کوئی پوچھتا نہیں
اس عاشقی میں عزتِ سادات بھی گئی

میر کے والد نے دنیا کے عوض دین اختیار کیا، گویا دنیوی وجاہت دادا کے ساتھ رخصت ہوگئی۔

افسوس کہ ۱۱۴۵ھ کے لگ بھگ جبکہ میر کی عمر صرف دس سال کی تھی، اُن کا بھی انتقال ہوگیا۔ بڑے بھائی حافظ محمد حسین نے میر صاحب کے ساتھ بڑی بے مروتی کی اور باپ کے ترکہ میں سے اُن کو ایک پیسہ نہ دیا۔ جب ہوش سنبھالا تو میر صاحب کو اپنی ذلت کا احساس ہوا کہ بھائی کے ٹکڑوں پر پڑا ہوں اور وہ ٹکڑے بھی بڑی ذلت کے ساتھ نصیب ہوتے ہیں۔ یہیں سے اُن کی "الم دوستی" کا آغاز ہوتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ انسان بعض خصایص ماں کے پیٹ ہی سے ساتھ لے کر پیدا ہوتا ہے لیکن "ماحول" اور حوادث روزگار کا بھی انسان کی طبیعت پر بڑا اثر پڑتا ہے، اگر میر صاحب ذکی الحس نہ ہوتے تو شاید بھائی کی جوتیاں کھاتے رہتے لیکن وہ فطرت کی طرف سے ایک زبردست قوتِ احساس لے کر آئے تھے۔ انہوں نے ترکِ وطن ہی کو بہتر خیال کیا۔ چنانچہ ۱۱۵۰ھ کے قریب دلّی آئے اور ایک دوست کی وساطت سے نواب صمصام الدولہ کی سرکار میں ملازم ہوگئے۔ یہ کس طرح ممکن تھا کہ میر صاحب چین سے رہتے؟ ۱۱۵۱ھ میں نادرشاہ ہندوستان کی صورت پر نازل ہوگیا، نواب موصوف مقابلہ کے لئے نکلے اور میدانِ جنگ میں مارے گئے۔ میر دوسری دفعہ یتیم ہوگئے۔ ابھی باپ کی وفات کا صدمہ دور نہ ہوا تھا کہ فلکِ کجرفتار نے ایک چرکا اور لگا دیا:۔

سانس رکھتی تن بسمل میں جو آتے جاتے
اور چرکا دیا جلّاد نے جاتے جاتے

مجبوراً پھر آگرہ چلے گئے اور چند سال جوں توں کر کے وہاں گزارے۔ غالباً اسی زمانہ میں حضرتِ عشق علیہ الرحمتہ نے اُن کی نوجوانی پر ترس کھا کر اُنہیں اپنی آغوشِ محبت میں لے لیا ہوگا۔ اسپنوزا ناکام ہو کر فیلسوف ہوگیا تھا میر صاحب اس مرتبہ پر پہنچ کر "شاعر" ہوگئے جب دریاتِ عشق سے فراغت پائی تو جیسا کہ اس فن کے ماہرین کا دستور ہے "تلاش معاش کے پردے میں" "دیارِ حبیب" سے ہجرت کرنے پر مجبور ہونے۔ اور ایسے نکلے کہ پھر جانا نصیب نہ ہوا۔

دوبارہ دلّی آئے اور خانِ آرزو کے یہاں مقیم ہوئے، چند روز گزرے تھے کہ اُن کے بڑے بھائی کو جو شقاوتِ قلبی میں اپنی نظیر نہ رکھتا تھا، یہ حال معلوم ہوا، اُس نے خان صاحب کو لکھا کہ عموی صاحب! یہ غضب!! آپ کا خون ایسا سفید ہوگیا، میرے سگے بھائی کے ساتھ آپ اس محبت سے پیش آتے ہیں شاید ست جگ میں ایسا ہوتا ہو، کلجگ میں تو یہ طریقِ عمل سراسر نامناسب ہی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ خانصاحب موصوف بھی میر صاحب کے درپئے آزار ہوگئے اس کج خلقی اور غیر متوقع ایذا رسانی نے میر صاحب پر زبردست اثر کیا، مہینوں دیوانوں کی سی حالت رہی۔ سچ ہے جب اپنے، پرائے ہوجائیں تو میر جیسے انسان

کو جس قدر صدمہ ہو تھوڑا ہے۔ یہ چوتھا وار تھا۔ ایک تو ویسے ہی فلک کے ستائے ہوئے تھے اوپر سے پے در پے یہ مصائب و آلام!!! کوئی تعجب نہیں اگر ایسا اندریں حالات ایک ذکی الحس انسان قنوطی (pessimist) ہو جائے!!! ممکن ہے دنیا میں راحت، عیش، آرام اور خوشی کا وجود ہو لیکن میر کے حصہ میں سوائے رنج و الم اور کلفت و غم کے اور کچھ نہ تھا۔ یہی رنگ اُن کے کلام میں جھلکتا ہے۔ شوپن ہار (جرمن فلاسفر) کو بھی حالات اور حوادث روزگار ہی نے قنوطی بنا دیا تھا۔ اگر اس کی ماں اُس کے ساتھ محبت کا برتاؤ کرتی تو وہ کبھی عورتوں سے اس قدر بدظن نہ ہوتا!

بہرکیف، ایک رئیس رعایت خان نامی نے انہیں اپنا مصاحب بنا لیا، لیکن کچھ عرصہ کے بعد کسی بات پر ناراض ہو کر ملازمت ترک کر دی۔ اس کے بعد یعنی سنہ ۱۱۷۰ھ کے لگ بھگ احمد شاہ ابدالی کے حملوں کا سلسلہ شروع ہوا ادھر جاٹوں اور مرہٹوں نے تاخت و تاراج شروع کی۔ دلّی پر پے در پے آفتیں نازل ہوئیں ہزاروں خاندان برباد ہو گئے۔ میر صاحب نے یہ سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا اور اس ہر فانی کی بے ثباتی کا نقش دل پر جم گیا چنانچہ خانہ نشین ہو گئے لیکن غزلوں کا شہرہ دور و نزدیک پھیل گیا تھا آصف الدولہ والیٔ اودھ نے بڑی قدردانی کے ساتھ طلب کیا اور

"اُن کے حال پر عنایت و مہربانی فرماتے رہے۔"

لکھنؤ آکر اگرچہ اُن کے سوز دروں میں کمی نہ ہوئی لیکن ایک حد تک آسودگی ضرور نصیب ہو گئی یعنی فکر معاش جاتی رہی جسے "آسودگی" کہتے ہیں وہ تو بادشاہوں کو بھی بمشکل نصیب ہوتی ہے، میر تو درپردہ چوٹ کھائے ہوئے تھے۔ ایسے لوگوں کو تو "تہ خاک بھی خاک آرام ہوگا"۔

"پیری و صد عیب" ایک مشہور بات ہے لیکن جن لوگوں کی جوانی پریشانی میں گزرتی ہے اُن کی "پیری" قابل دید ہوتی ہے۔ چنانچہ میر صاحب نے اپنی حالت یوں لکھی ہے "اس زمانہ میں میرا مزاج ناساز رہتا ہے، یاروں کی ملاقات ترک کر دی ہے، بڑھاپا آپہنچا عمر عزیز ساٹھ سال کی ہو گئی۔ اکثر اوقات بیمار رہتا ہوں۔ کچھ دنوں آنکھ کے درد کی تکلیف اٹھائی، ضعف بصر سے عینک لگائی۔ دانتوں کے درد کا کیا ذکر کروں؟ آخر کار، دل کڑا کر کے، ایک ایک کو جڑ سے اکھڑوا دیا، غرضکہ ضعف قویٰ، بے دماغی، ناتوانی دل شکستگی اور آزردہ خاطری سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زیادہ عرصہ تک زندہ نہ رہوں گا اور زمانہ بھی رہنے کے قابل نہیں رہا ہے بس اس قدر آرزو ہے کہ خاتمہ بالخیر ہو۔"

ان کی وفات ۱۲۲۵ھ میں ہوئی۔ اُن کا مزار "عیش باغ" لکھنؤ میں زیارت گاہِ خاص و عام تھا لیکن ۱۸۵۷ء کے بعد "زائرین" کا رُخ سرکاری دفاتر کی طرف پھر گیا، مجبوراً "بی این۔ ڈبلیو۔ آر" نے مزار کو اپنی نگہداشت میں لے لیا۔ نتیجہ یہ ہے کہ آج نشان قبر ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتا۔

میر کو نشانِ قبر کے محفوظ رہنے کی چنداں ضرورت بھی نہیں، صاحبانِ کمال کا مزار تو "سینہ ہائے عارفاں" میں ہوتا ہے۔ جب تک اردو زبان زندہ رہے گی میر کا نام بھی زندہ رہے گا۔ وہ تو خود ہی فرما گئے ہیں:۔

بارے دنیا میں رہو غمزدہ یا شاد رہو
ایسا کچھ کر کے چلو یاں کہ بہت یاد رہو

یوسف سلیم

دریائے لُطف

مغربی، مشرقی تہذیب میں جو فرق ہے وہ قطعی ایک لفظ میں بیان کیا جا سکتا ہے یعنی اُس قسم کا ایک لفظ نہیں جو پادری صاحبان کے وعظ کے خاتمے پر یوں شروع ہوتا ہے۔

"ایک آخری لفظ۔ دنیا و مافیہا کی ذمہ داریوں کو مدنظر رکھتے ہوئے قومی بہبودی کے زریں اصول کو نہ ہمارے بزرگوں نے بھلایا ہے نہ ہمیں بھلانا چاہیئے"۔ وغیرہ وغیرہ۔ یہ ایک آخری لفظ کئی صفحوں پر دراز ہوتا ہے۔ سننے والے انگڑائیاں لیتے ہیں کہ خدا کرے کہ اس ایک آخری لفظ کی جان نکلے اور ہم چندہ دے کر گھر کو سدھاریں۔

سعدی شیرازی رحمۃ اللہ علیہ جہاں اور بہت کچھ لکھ گئے ہیں اس ایک لفظ کو بھی استعمال کر گئے ہیں وہ لفظ

لُطف

ہے اور سعدی جیسا ناصح ضد کرتا ہے کہ ؎

لطف کُن لُطف، کہ بیگانہ شود حلقہ بگوش

اہلِ چین نے تو اس پر یہاں تک عمل کیا کہ مخاطب کے جوتے کا ذکر کرنا مقصود ہو تو اس سے کم نہ کہتے تھے کہ "آنجناب کا آنریبل بوٹ" اور اپنے گھر کو بدیں الفاظ یاد کرتے تھے کہ اس ذرۂ بے مقدار ہیچ ابن ہیچ کی تنگ شہر جھونپڑی یعنی مخاطب کے جوتے اور بولنے والے کے گھر کا نقشہ غالب مرحوم کے اس شعر میں کھنچتا ہے

وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے —— کبھی ہم اُن کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

کیا جوتا ہوگا کیا گھر ہوگا مگر "لطف" میں شک نہیں۔ یہ لطف اہلِ مغرب کو نصیب نہیں۔

کاغذاتِ مال کی بعض اصطلاحیں نہایت پُرلطف ہیں۔ یورپ والوں کے ہاں کسی جدول کا کوئی خانہ خالی ہو تو اُسے بلینک (Blank) لکھ دیتے ہیں۔ اس قدر کمبخت اکھڑ ہیں کہ (Blank) کو (blank) ہی لکھتے ہیں۔ ایشیائی ایسا اکھڑ کیوں ہونے لگا کہ خالی کو خالی لکھے یا کہے چنانچہ کاغذاتِ مال میں اگر کوئی خانہ خالی ہو تو اس میں لفظ "معمور" لکھا جاتا ہے۔ ایسے خانوں کی ہستی نیستی سے آباد ہوتی ہے بلطف ہُوا نا کہ خلا کو آباد کر دیا۔ اسی طرح غیر آباد دیہہ کو محض بے مذاقی سے "غیر آباد" نہیں لکھا جاتا بلکہ مقررہ اصطلاح ہے کہ "بے چراغ" لکھا جائے۔ اس "لطف" میں شاعری بھی ہے۔ لاہور کا میلہ چراغاں مشہور ہے۔ ایک شاعر کا مصرعہ

"اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے"

زندہ جاوید ہے اور مرزا غالب کا مصرعہ :-

"جوشِ قدح سے بزم چراغاں کئے ہوئے"

تو بجائے خود ایک نہ مٹنے والا ہنگامہ ہے۔ اگر پٹواری کا کسی گاؤں کو "بے چراغ" کہنا اور لکھنا ایشیائی تہذیب "لطف" کا کمال ہے نہ انسان ہوں گے نہ چراغ جلیں گے مگر یہ نہیں کہا کہ گاؤں میں باشندے نہیں۔

اس قسم کے لطف کی کوئی حد نہیں۔ ایشیا میں کبھی کوئی بیمار ہی نہیں ہوتا ہمیشہ دشمنوں کی طبیعت علیل رہتی ہے ہر قسم کے حوادث نصیبِ اعدا ہوتے ہیں کبھی کسی قسم کا گھاٹا نہیں ہوتا۔ "دل گیا ہاتھ سے لوگوں نے کہا دل آیا"۔ زندگی کے ہر شعبے میں اس لطف کا ظہور ہے! اولاد کو والدین کا سایہ عزیز ہے۔ ماتحت کے لئے افسر "حضور"۔ "خداوند" سے کم نہیں۔ بادشاہ "جہاں پناہ ظلِ الٰہی" ہے۔ درزی "خلیفہ" ہے۔ حجام "راجہ" ہے بھنگی "مہتر" ہے۔

اس لطف کی داستان طویل ہے ایشیائی زندگی قلیل ہے۔ کاش ہمارے بزرگ اس لطف کے سمندر کے علاوہ کچھ اور بھی چھوڑ جاتے۔ فارسی میں "دریا" سمندر کو کہتے ہیں اور فلک پیما سعدی کے اس شعر پر اس تحریر کو ختم کرتا ہے ؎

بہ دریا در منافع بے شمار است ۔۔۔ دگر خواہی سلامت برکنار است

فلک پیما

بہارِ بے خزاں

بہار آئی ہے اس رنگیں ادا کو پھر سنورنا ہے ۔۔۔ میرے دعوائے ضبطِ عشق کو مجروح کرنا ہے

الٰہی ہر تمنّائے دروں کا خون ہو جائے! ۔۔۔ کہ تصویرِ وفا میں اور ابھی کچھ رنگ بھرنا ہے

یہ کلیاں جن کی رعنائی ہے وجہِ زینتِ گلشن ۔۔۔ انہیں اک روز اجزائے خزاں بن کر بکھرنا ہے

سنبھلنے دے مجھے اے گریۂ احساسِ آزادی

قفس میں بند رہ کر گلستاں تعمیر کرنا ہے

محمد جمیل خاں راز

عمر خیّام

کیونکر

مرتے مرتے بچا

حکیم عمر خیّام کے نام کا ڈنکا آج مشرق و مغرب میں بج رہا ہے' اگرچہ مشرق کی بوالعجبی کا یہ عالم ہے کہ اب اکثر یہ مغرب ہی کے توسط سے اپنے اکابر کو پہچانتا ہے۔ اگر رباعیات خیّام اتفاق سے مغرب میں نہ جا پہنچتیں اور وہاں بھی ایک ہنرشناس کی نظر چڑھ کر ان کی قدر نہ کھلتی تو کوئی اس گنجینۂ معنی کو کوڑیوں کے بھاؤ بھی نہ پوچھتا۔ ایک مغربی ادیب نے اس اجمال کی تفصیل حوالۂ قلم کی ہے اور یہ مضمون اُسی کا مفاد ہے۔ بلاشبہ اگر فٹز جیرلڈ رباعیات خیّام کا ترجمہ نہ کرتا تو شاید دنیا خیّام کی حقیقی عظمت سے واقف بھی نہ ہوتی۔ آج مغرب میں خیّام کی رباعیات کے بیسیوں مطلّا اور مذہّب نسخے شائع ہو چکے ہیں اور مصوّروں نے ان رباعیات کی تصویریں کھینچ کھینچ کر بجائے خود ایک بوقلموں نگارخانہ پیدا کر دیا ہے۔ یقیناً فٹز جیرلڈ کو اپنی محنت کی قیمت رباعیات کی اِس آفاق گیر مقبولیت کی صورت میں وصول ہو گئی ہے۔

ایڈورڈ فٹز جیرلڈ ۱۸۰۹ء میں پیدا ہوا۔ اُس کا باپ ایک متمول زمیندار تھا جس کی میراث نے اُس کو اپنی افتادِ طبیعت کے مناسب بافراغت زندگی گزارنے کے قابل بنا دیا۔ فٹز جیرلڈ نے گاؤں کے کنجِ عافیت کو شہر کی پُرشور و شغب فضا پر ترجیح دی اور اپنے تخیلات میں گم، راہبانہ زندگی بسر کرنے لگا۔ اس کی خوراک صرف سبزی ترکاری تھی۔ گویا اپنے دوست ٹینی سن کے الفاظ میں وہ دودھ گندم اور گھاس پر گزارا کرتا تھا۔ اس نے بہت سی کتابیں لکھیں جو تقریباً سب کی سب طاق نسیاں کی زینت ہو چکی ہیں۔ ہاں نظم کی ایک کتاب ضرور مستثنےٰ ہے اور اُسی نے فٹز جیرلڈ کے نام کو زندۂ جاوید بنا دیا ہے۔ اُس نے چوالیس سال کی عمر میں ایران کے شاعر اور حکیم عمر خیّام کی رباعیات کے ترجمے کا کام شروع کیا۔ خیام خود بھی فٹز جیرلڈ ہی کی طرح زندگی کے گلستان زاروں کا ایک بےفکر تماشائی تھا۔ سالہا سال کی محنت کے بعد فٹز جیرلڈ نے اپنا مسودہ "فورٹ نائٹلی ریویو" کے ایڈیٹر کے سپرد کیا لیکن ایڈیٹر صاحب نے سال بھر یہ مسودہ اپنے پاس رکھ کر آخر مترجم کو واپس بھیج دیا کہ یہ ہمارے معیارِ ادب کے مطابق نہیں ہے۔ ناچار فٹز جیرلڈ نے خود اس کو چھپوایا لیکن چونکہ اُسے اِس کا کوئی بھی گاہک نہ مل سکا اس لئے اُس نے تمام جلدیں ایک کتب فروش "برنارڈ کواریچ" کو ہدیتہً دے دیں۔ کتب فروش نے پہلے تو کتاب کی قیمت پانچ شلنگ سے نصف کرا دی اور اُس کے بعد ایک شلنگ اور آخر دکان سے باہر ہاٹ لگا کر ایک ایک پینی میں فروخت کرنی شروع کر دی۔ قسمت کا کھیل دیکھئے کہ رباعیات کا ایک نسخہ اتفاقاً

روزیٹی نے بھی خریدا۔ چند اوراق اُلٹ کر دیکھتے ہی وہ اِس کا اتنا مداح ہو گیا کہ اُس نے اپنے تمام دوستوں کو اس کے خریدنے کے لئے دوڑایا۔ سون برن نے چار جلدیں حاصل کیں اور یوں اس کتاب کی مانگ شروع ہو گئی۔ اب تو یہ خیال بھی عجیب معلوم ہوتا ہے کہ اگر روزیٹی کی جوہر شناس نظر اتفاقاً اس پر نہ جا پڑتی تو انگریزی شاعری کے خزانے کا ایک گوہر بے بدل ہمیشہ کے لئے کھو جاتا۔

اس چھوٹی سی کتاب میں اس کے غیر معمولی شعری حسن کے علاوہ دو اور خصوصیات ہیں جنہوں نے اس کو اس درجہ مقبولِ انام بنا دیا ہے ان میں سے ایک تو اِس کا محبوبِ عام فلسفۂ زندگی ہے۔ جسے ہم ہیرک کے گیت سے مشابہ قرار دے سکتے ہیں:۔

پھول کچھ چن لو کہ پل میں بیت جاتی ہے بہار

یا نظیر اکبر آبادی کے ان الفاظ سے کہ:۔

زندگی دو دن کی ہے لے جان ہنس لے، بول لے حُسن یہ دو دن کا ہے مہمان ہنس لے، بول لے

اور دوسری خصوصیّت اِس کے مشرقی نظاروں کا گہرا اور شوخ آبِ رنگ ہے۔ اُس وقت سے لے کر جب صبح سلطان کے قصر کے کنگروں کو نور کی ایک چھڑی سے چھُونے کے لئے آتی ہے اُس وقت تک جب ساحرِ شفق چاروں کھونٹ اپنے حیرت زا حُسن کا افسوں پھونکنے لگتا ہے اور چاند کا عظیم الہیئت قرص اُن شمیم انگیز گلستانوں پر بالکل قریب ہی معلّق نظر آتا ہے جہاں مہمان گلاب کے ہار پہنے، بادۂ گلرنگ کے جام ہاتھوں میں لئے گھاس کے سبز فرش پر بیٹھے بکھرے ہوئے ستاروں کی طرح معلوم ہوتے ہیں، آنکھیں ایک حیرت ناک جنّت کے پُراسرار خواب دیکھتی رہتی ہیں۔

ٹینی سن نے موسیقی حسنِ ادا اور رنگینی کے اعتبار سے اس کو دنیا کا بہترین ترجمہ قرار دیا تھا۔ یہاں میں چند اشعار انگریزی سے اردو میں منتقل کئے دیتا ہوں جو ٹینی سن کو بھی تمام بالغ نظر سخن شناسوں کی طرح خاص طور پر محبوب تھے۔

آ، تو بھی مئے ارغواں سے اپنا ساغر لبالب بھر لے۔
اور جامۂ توبہ کو تار تار کر کے بہار کی شعلہ بار منقل میں جھونک دے۔
طائرِ وقت کو تھوڑا ہی فاصلہ طے کرنا ہے۔
اور دیکھ اُس کی پرواز شروع بھی ہو چکی ہے۔

سایہ دار درخت ہو اور گیتوں کی ایک کتاب،
اور مینائے مے، اور روٹی کا ایک ٹکڑا ـــــــ اور تو
میرے پہلو میں بیٹھی جنگل کی فضا کو اپنے نغموں سے معمور کر رہی ہو۔

آہ پھر جنگل جنگل کہاں رہے، جنت، ہو جائے۔

لوگ کہتے ہیں، جہاں جمشید کے نغمے قلقلِ مینا سے ہم آہنگ رہتے تھے۔
وہاں اب چھپکلیاں اور لگڑ بگڑ دربار لگاتے ہیں۔
اور جنگلی گدھے بہرام جیسے عظیم الشان شکاری کے سر پر دولتیاں چلاتے ہیں۔
لیکن وہ اِس قیامت کی نیند سویا ہے کہ پہلو بھی نہیں بدلتا

ہائے ہائے! بہار بھی پھول کے ساتھ ہی غائب ہو جاتی ہے۔
اور صحیفۂ شباب کا آخری مشکبار ورق بھی الٹ جاتا ہے۔
ابھی جو بلبل ڈال ڈال پات پات چہکتا ہوا نظر آتا تھا۔
وہ کدھر اڑ کر چلا گیا، اور وہ کہاں سے آیا تھا ——— کون بتائے؟

آہ اے میرے محبوب اگر تو اور میں تقدیر سے مل کر سازش کر سکتے۔
اور اِس المناک صورتِ حالات پر قابو پا لیتے۔
تو اے میرے پیارے ہم کس طرح اِس کے پرخچے اڑاتے
اور پھر حسبِ منشا اِسے اپنی آرزوؤں کے قالب میں ڈھال لیتے۔

شعر کا یہ گنجِ شائیگاں ضائع ہوتے ہوتے بچا۔ اہلِ مغرب کا دل اب اس امکان کے شائبے سے بھی لرز جاتا ہے اور مشرق تو شاید اب بھی خیّام کی حقیقی منزلت سے ناواقف ہے۔ کوئی کیا کہے؟

حامد علی خاں

دیکھو تو دلفریبیٔ اندازِ نقشِ پا — موجِ خرامِ یار بھی کیا گل کتر گئی
نظارے نے بھی کام کیا واں نقاب کا — مستی سے ہر نگہ ترے رخ پر بکھر گئی

مئے دو آتشہ

حکیم عمر خیام

گر بادہ خوری تو با خرد منداں خور، یا با صنمے سادہ رخِ خنداں خور
بسیار مخور، ورد مکن، فاش مساز اندک خور و گہ گاہ خور و پنہاں خور

ترجمہ

جب بادہ پیو، با صنمِ چیدہ پیو یا ہمرہِ دوستانِ سنجیدہ پیو،
ایسا نہ ہو، یہ مشغلہ رسوا ہو جائے کم کم پیو، گہہ گہہ پیو، پوشیدہ پیو،

حکیم عمر خیام

اے آنکہ پدید گشتم از قدرتِ تو پروردہ شدم بہ ناز از نعمتِ تو
صد سال بہ امتحاں گنہ خواہم کرد یا جرمِ من ست بیش یا رحمتِ تو

ترجمہ

اے میری بقا کا راز قدرت تیری اے میرے لئے ہر ایک نعمت تیری
سو سال گناہ کر کے یہ دیکھوں گا عصیاں ہیں مرے سوا کہ رحمت تیری

حکیم عمر خیام

تا باز شناختم من ایں پائے ز دست ایں چرخ فرو مایہ مرا دست بہ بست
افسوس! کہ در حساب خواہند نہاد عمرے کہ مرا بے مئے و معشوق گزشت

ترجمہ

انصاف کرو، قضا سے کس طرح پٹے جب تک یہ ستمگر اپنی ضد سے نہ ہٹے
کیا ظلم نہیں، حساب میں داخل ہو وہ عمر کہ جو بے مئے و معشوق کٹے

حکیم عمر خیام

سر دفترِ عالمِ معانی عشق ست سر بیتِ قصیدۂ جوانی عشق ست
اے آنکہ خبر نہ داری از عالمِ عشق ایں نکتہ بداں کہ زندگانی عشق ست

ترجمہ

سر دفترِ عالمِ معانی ہے تو عشق سر بیتِ قصیدۂ جوانی ہے تو عشق
اے عالمِ رازِ عشق سے ناواقف! یہ نکتہ سمجھ کہ زندگانی ہے تو عشق

آزاد انصاری

شعرائے اردو کا ایک قدیم تذکرہ

میرے محترم عنایت فرما جناب حکیم سید علی صاحب آشفتہ لکھنوی کے قیمتی ذخیرۂ کتب میں اردو شاعروں کا ایک تذکرہ فارسی زبان میں ہے۔ اس کے شروع اور آخر کے چند ورق غائب ہیں اس لئے کتاب اور مصنف دونوں کا نام معلوم نہیں ہوسکتا۔ میر تقی میر کے ذکر میں مصنف لکھتا ہے "تا حالتِ تحریر این گلشن سخن کہ سن یک ہزار و یک صد و نود و چہار ہجریست بسلامت استقامت دارد" اس عبارت سے یہ خیال ہوسکتا ہے کہ اس تذکرے کا نام "گلشن سخن" ہے لیکن سیاقِ عبارت سے یہ بات زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتی ہے کہ مصنف نے اس نظر سے کہ یہ کتاب منتخب اشعار کا مجموعہ بھی ہے اس کو استعارہ کے طور پر گلشنِ سخن قرار دیا ہو۔

مصنف کا جو جملہ اوپر نقل کیا گیا ہے وہ بتاتا ہے کہ یہ تذکرہ ۱۱۹۴ھ میں لکھا گیا۔ اس کے علاوہ سنِ تالیف کا ذکر اور بھی متعدد مقامات پر آیا ہے مثلاً:-

"الحال کہ ۱۱۹۴ھ است در زمرۂ متوسلاں نواب مبارک الدولہ بہ پریشانی بسر می برد" (حال ہیبت قلی خان میر محمد حیات حسرت)

"تا حال کہ ۱۱۹۴ہجری بہولیت در قید حیات است" (حال مرزا جعفر علی حسرت)

"تا ایں زمان کہ سنہ یک ہزار و یک صد و نود و چہار ہجری است گوشۂ انزوا اختیار نمودہ بہرہ یاب فیوضات نامتناہی الٰہی است" (حال خواجہ میر درد)

"الحال کہ ۱۱۹۴ہجری یک ہزار و یک صد و نود و چہار است در عظیم آباد بوارستگی تمام بلا تعین مکان زندگانی میکند" (حال میر حمزہ علی رند)

"تا حال کہ سنہ یک ہزار و یک صد و نود و چہار ہجری ست در لکھنؤ استقامت دارد" (حال مرزا سودا)

"تا ایں زماں کہ سنہ یک ہزار و یک صد و نود و چہار ہجری ست در لکھنؤ می گزراند" (حال میر سوز)

"تا ایں زمان کہ سال یک ہزار و یک صد و نود و چہار ہجریست در بلدہ مذکور (عظیم آباد) بشغل وجد و حال اکثر می باشد" (حال شاہ رکن الدین عشق مشہور بشاہ گھسیٹا)

پوری کتاب میں جہاں کہیں مولف نے دورانِ تالیف کے کسی واقعے کا زمانہ بتایا ہے وہاں ہمیشہ ۱۱۹۴ھ کا ذکر کیا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ تذکرہ اسی سن میں شروع ہوا اور اسی میں ختم ہوا۔

اردو شعرا کے جتنے تذکروں کا حال اب تک معلوم ہو چکا ہے ان میں سے کوئی ۱۱۹۴ھ کا تصنیف کیا ہوا نہیں ہے جو تذکرہ اس سنہ سے

قریب ترین زمانے میں لکھا گیا وہ نواب علی ابراہیم خان کا تذکرہ گلزار ابراہیم ہے جس کی تصنیف کا سال ۱۱۹۶ھ ہے ۔

مصنفِ تذکرہ کا نام تو خیر معلوم ہی نہیں اُن کے وطن کے متعلق بھی کوئی بات یقینی طور پر نہیں کہی جا سکتی۔ البتہ ذیل کی عبارتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ مصنّف کا قیام دہلی میں رہا تھا :-

ذاکر شمس میر حسین دوست ابن میر علی دوست متوطن مراد آباد آمعیل چند سال در شاہجہان آباد میر مسطور مدرّس خسرو پور ہائے راقم مرزا محمد رفیع خان و بدیع الزماں خاں بود"۔

"رسوا ناَمش مہتاب رائے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ راقم دیرا بارہا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ در دہلی دید"۔

"میر عبدالحی تاباں دہلوی ۔ ۔ ۔ میر مسطور را فقیر ہم در عہد محمد شاہ مغفور دیدہ بود"

اسی طرح عبارتِ ذیل بتاتی ہے کہ مصنف کا کچھ وقت مرشد آباد میں گزرا تھا :-

"صانع بلگرامی ۔ ۔ ۔ ۔ از آشنایان ایں راقم آثم است در مرشد آباد زمان ثروت نواب میر محمد جعفر خان اکثر باتفاق ہم عزلہا طرح می شد"

ذیل کی عبارت میں "از دہلی بہ مرشد آباد آمد" کے فقرے سے قیاس کیا جا سکتا ہے کہ مصنفِ تذکرہ یہ عبارت لکھتے وقت مرشد آباد میں موجود تھا۔

"درد مند شمس فقیہ ۔ ۔ ۔ حسب الطلب نواب شہامت جنگ از دہلی بہ مرشد آباد آمد"

اسی طرح عبارتِ ذیل میں "بہ عظیم آباد آمدہ" کا فقرہ ظاہر کرتا ہے کہ یہ عبارت لکھتے وقت مصنفِ تذکرہ کا قیام عظیم آباد میں تھا۔

"میر شاہ علی خاں دہلوی ۔ ۔ ۔ در عہد نواب سراج الدولہ بہ بنگالہ رسید ۔ ۔ ۔ ۔ بزمانہ دولتِ نواب عالیجاہ میر محمد قاسم خان بہ عظیم آباد آمدہ چندے ملازم نواب بودہ بدکھن رفت"۔

جو عبارتیں اوپر نقل کی گئی ہیں اُن سے ضمناً یہ بھی معلوم ہو گیا کہ مصنّف تذکرہ کے دو سالے مرزا محمد رفیع خان و بدیع الزمان خاں دہلی میں رہتے تھے اور اُن کو میر حسین دوست ذاکر آمعیل نے کئی سال پڑھایا تھا ۔ اور یہ بھی کہ مصنف سے صانع بلگرامی سے دوستی اور مہتاب رائے رسوا دہلوی سے ملاقات تھی ۔ مصنف نے اپنے دوستوں اور شناساؤں کا ذکر اور بھی کئی جگہ کیا ہے متعلقہ عبارتیں ذیل میں نقل کی جاتی ہیں :-

"راقم حروف نے (سید انشا) را در صغر سن ہنگام دولتِ نواب میر محمد جعفر خان بہادر دیدہ بود و بوالد ایشاں آشنا بود ۔ در نیولا مسموع شد کہ مرد مستعد و بحلیۂ خوبی ہا مزین است"۔

"سلسلۂ نسب ایشاں (مرزا عباس علی) بہ نواب علی مردان خان مغفور می رسد با راقم خانِ مذکور دوستی و مہربانی مفرط داشت"۔

"فدوی دہلوی نامش مرزا محمد علی مشہور بہ مرزا بچو ۔ ۔ ۔ ۔ ذہنش در ریختہ گوئی رسا و با راقم آشنا"۔

"میر غلام علی آثم دہلوی شاگرد میر شمس الدین فقیر بودہ شعرِ فارسی خوب می گفت و با فقیر ہم دوستی داشت"۔

خانِ موصوف (نواب بہادر رستم علی خاں رستم) مع برادر خرد رفیق نواب والا شان سعادت علی خان بہادر اند در بنارس

رحلِ اقامت انداختہ اند۔ راقم را یک مرتبہ اتفاقِ ملاقات ہر دو صاحبان شدہ“۔

”تغیرِ احوالِ ایشاں از محمد روشن جوشش مفصل از بعضو نے رائے خلف جسونت رائے کہ فی مابین خصوصیتہا و دوستی ہا ست معلوم شد“۔

مصنف تذکرہ مذہباً شیعہ تھا جیسا کہ ذیل کی عبارت سے ظاہر ہے جو مرزا جانِ جاناں مظہر کے متعلق لکھی گئی ہے:۔

”تعصبِ مذہب سنت جماعت بدیں حد جائگاہ در دلش نمودہ بود کہ مردم را منع از تعزیہ سید الشہدا علیہ السلام می کرد۔ صد سال عمر یافت و در ہمیں ضلالت بسر برد۔ قبل ازیں مسموع شد کہ یکے از ساکنانِ دہلی دیرا کشت و لبسزائے کہ وارش رسانید“

مرزا مظہر کا ذکر جن لفظوں میں کیا گیا ہے اُن سے مصنف تذکرہ کا متعصب شیعہ ہونا ظاہر ہوتا ہے لیکن حقیقت شاید اس کے خلاف ہے معلوم ہوتا ہے کہ اس کو مرزا مظہر سے بیزاری صرف اس بنا پر تھی کہ وہ تعزیہ داری کی مخالفت کرتے تھے اور یہ بات ایسی ہے جس کو ہر شیعہ انتہائی ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتا ہے میرے اس خیال کی تائید اُس عبارت سے ہوتی ہے جس میں مصنف نے ایک دوسرے اہلِ سنت صوفی بزرگ یعنی خواجہ میر درد کی خوب دل کھول کر عقیدتمندانہ انداز میں تعریف کی ہے۔ وہ عبارت حسب ذیل ہے:۔

”خواجہ میر درد خلف الصدق خواجہ ناصر دہلوی ست۔ مرکز دائرۂ اہل کمال سخن سنج، نکتہ رس، شیرین مقال، قطع نظر از مہارتِ فنونِ سخن کہ در آں مرتبۂ آن والا مقام است در خدا پرستی و تحمل مصائب و تسلیم نوائب نظیر خود ندارد۔ سید عالی منزلت، مقیم گوشۂ عزلت، رہبر شہرستان تفرید، د سائر کوچہ تجرید، . . . . . در شاہجہاں آباد تا ایں زماں کہ سن یک ہزار و یک صد و نود و چار ہجری است گوشۂ انزوا اختیار نمودہ بہرہ یاب فیوضات نامتناہی الٰہی است“۔

مصنف تذکرہ نے میر تقی میر کے تذکرۂ شعرا کا ذکر ان لفظوں میں کیا ہے۔ ”تذکرۂ مختصرے مشتمل بر احوال و انتخاب اشعار ریختہ گویاں تالیف نمودہ“ ایک دوسری جگہ جنون دہلوی کے اشعار نقل کرنے سے پہلے لکھا ہے ”ایں ابیات کہ از تذکرۂ میر محمد تقی میر نقل نمودہ بتحریر می آرد“ اس عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ مصنف نے میر کا تذکرہ دیکھا تھا اور وہ اس تذکرے کی تصنیف کے وقت اُس کے پیش نظر تھا کسی اور تذکرے کا ذکر کہیں نہیں ہے۔ البتہ مرزا سودا کے شاگرد میر فخر الدین فخر کے والد اشرف علی خان کو ”تذکرہ نویس“ لکھا ہے مگر معلوم نہیں کہ یہاں تذکرے سے تذکرۂ شعرا مقصود ہے یا کچھ اور۔

عام تذکروں کی طرح اس میں بھی صرف غزل گو شعرا کا حال ہے۔ غزل کے علاوہ اور اصنافِ سخن جن میں شعرا نے طبع آزمائی کی ہے اُن کا ذکر نہیں کیا گیا۔ البتہ جعفر علی خان ذکی اور میر غلام حسین شورش کی مثنویوں، مرزا جعفر علی حسرت، سودا اور شورش کے قصیدوں میر سوز مظلوم، میر محمد علی صبر اور خلیفہ سکندر کے مرثیوں، حمایت علی مجنوں اور نقیبہ درد مند کے ساقی ناموں کا ذکر ضمناً آگیا ہے اور فدوی لاہوری کے متعلق لکھا ہے ”گویند یوسف زلیخا بزبانِ ریختہ نظم کردہ“ بڑی بات یہ ہے کہ تین شاعروں کی نظم کے ساتھ اُن کی نثر کی بھی تعریف کی گئی ہے۔ میر جبار علی بسمل کے متعلق لکھا ہے کہ ”در نثر سلیقہ دارد“ معلوم نہیں کہ وہ فارسی نثر لکھتے تھے یا اردو۔

اسی طرح محمد روشن جوشش کے متعلق صرف اتنا لکھا ہے کہ "در نظم و نثر صاحب استعداد" البتہ محمد علی حشمت کی اردو نثر نگاری کی صراحت ان لفظوں میں کر دی ہے۔ "در انشائے ریختہ سلیقۂ نیکو داشت و تاباں در ایں فن بہرہ وافی ازو برداشت"۔ آخری جملے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ میر عبدالحی تاباں نے حشمت سے اردو انشا پردازی سیکھی تھی۔

مصنف تذکرہ نے میر سعادت علی سعادت کے متعلق لکھا ہے "وطنش امروہہ مرید شاہ ولایت اللہ مداح ائمہ ہدا است و در شعر ریختہ طرز ایہام اکثری ورزد"۔ عجب نہیں کہ یہ وہی میر سعادت علی امروہوی ہوں جنہوں نے میر تقی میر کو اردو میں شعر کہنے کی ترغیب دی تھی اور جن کا ذکر میر نے اپنی کتاب ذکرِ میر میں اس طرح کیا ہے:۔

"بعد از چندے با سعادت علی نام سیدے کہ از امروہہ بود برخوردیم۔ آں عزیز مرا تکلیفِ موزوں کردن ریختہ کہ شعریست بطور شعر فارسی بزبان اردوے معلٰی بادشاہ ہندوستان و در آں وقت رواج داشت کرد۔ جہد بلیغ کرده دم مشق خود بمرتبۂ رسانم کہ موزونان شہر را مستند شدم۔ شعر من در تمام شہر دوید و بگوش خرد و بزرگ رسید" (ذکر میر مطبوعہ ص۶۷)

اوپر لکھا جا چکا ہے کہ زیر نظر نسخہ ناقص ہے۔ شروع میں حرفِ الف سے شروع ہونے والے تخلص کے کچھ شعرا اور آخر میں حرف م سے شروع ہونے والے کچھ اور ن، و، ہ اور ی سے شروع ہونے والے کل شعرا کا حال غائب ہے۔ اس سے مصنفِ تذکرہ کے متعلق یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اگر وہ شاعر تھا اور غالباً تھا، تو اس کا تخلص الف، م، ن، و، ہ یا ی سے شروع ہوتا ہوگا۔ اگر کسی اور حرف سے شروع ہوتا تو اس کا ذکر اس موجودہ نسخے میں کہیں نہ کہیں موجود ہوتا۔

زیر بحث تذکرے کے اس نامکمل نسخے میں ۳۰۸ صفحے ہیں۔ ہر صفحے میں ۱۱ سطریں ہیں اور دو سو نو (۲۰۹) شاعروں کا نہایت مختصر حال اور اُن کے کلام کا انتخاب ہے۔ ان شاعروں کی فہرست ذیل میں درج کی جاتی ہے:۔

اصل تذکرے میں شعرا کے تخلص حروفِ تہجی کے اعتبار سے درج کیے گئے ہیں مگر ان کی ترتیب میں صرف ابتدائی حرف کا اعتبار کیا گیا ہے۔ ذیل کی فہرست میں سب حرفوں کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ اس طرح ہر تخلص کی ایک مخصوص جگہ معین ہوگئی ہے جن شاعروں کے تخلص معلوم نہیں صرف نام معلوم ہیں اُن کے نام گو نام ہی کے خانے میں لکھے گئے ہیں مگر ان کی ترتیب تخلصوں کے سلسلے میں رکھی گئی ہے

شمار	تخلص	نام	شمار	تخلص	نام	شمار	تخلص	نام	شمار	تخلص	نام
۱	اثر	•	۵	احسن	مرزا احسن علی	۹	آشنا	•	۱۳	الہام	شیخ شرف الدین
۲	اجل	محمد اجمل	۶	احمدی	شیخ احمد	۱۰	اظہر	میر غلام علی	۱۴	انشا	انشاء اللہ خان
۳	ب	خواجہ احتشام حسین	۷	•	اسدیار خان	۱۱	افسوس	میر شیر علی	۱۵	انصاف	محمد یحییٰ
۴	احسان	میر شمس الدین	۸	آشفتہ	مرزا رضا قلی	۱۲	الم	خلف خواجہ میر درد	۱۶	اولیا	میر اولیا

۱۷	آہ	میر مہدی	۴۲	تمنا	مرزا علی رضا	۶۷	حسن	خواجہ حسن	۹۲	دوست	غلام محمد
۱۸	بسمل		۴۳	ثابت	اصالت خان	۶۸	حسن	میر غلام حسن	۹۳	دیوانہ	سرب سنگھ
۱۹	بسمل	میر جبار علی	۴۴	ثاقب	شجاعت اللہ خان	۶۹	حشمت	سید محتشم علی خان	۹۴	ذاکر	میر حسین دوست
۲۰	بقا	بقاء اللہ	۴۵	ثاقب	شہاب الدین	۷۰	حشمت	محمد علی	۹۵	ذہین	میر مستعد
۲۱	•	بھکاری لال	۴۶	جرأت	میر شیر علی	۷۱	حضور	•	۹۶	راغب	محمد جعفر خان
۲۲	بہار	ٹیک چند	۴۷	جرأت	یحییٰ اماں	۷۲	حضور	شیخ غلام یحییٰ	۹۷	راقم	بندرابن
۲۳	بیان	احسن اللہ	۴۸	جگن	•	۷۳	حیدری	غلام حیدر	۹۸	رخشاں	محمد چاند
۲۴	بیتاب	سنتوکھ رائے	۴۹	جنون	•	۷۴	حیدری	شیخ غلام علی	۹۹	رخصت	میر قدرت اللہ
۲۵	بیتاب	محمد علیم	۵۰	جنون	شیخ غلام مرتضیٰ	۷۵	حیران	میر حیدر علی	۱۰۰	رسائی	•
۲۶	بیتاب	میر مدن بہادر	۵۱	جوان	کاظم علی	۷۶	حیران	میر منو	۱۰۱	رستم	رستم علی خان
۲۷	بیدار	میر محمدی	۵۲	جودت	رائے ہردے رام	۷۷	حیف	موتی لال	۱۰۲	رسوا	مہتاب رائے
۲۸	بیکل	سید عبدالوہاب	۵۳	جوشش	محمد روشن	۷۸	خادم	خادم حسین	۱۰۳	رشید	•
۲۹	بینوا	•	۵۴	جولاں	میر رمضان علی	۷۹	خاکسار	محمد یار	۱۰۴	رضا	میر محمد رضا
۳۰	پاکباز	میر صلاح الدین	۵۵	جوہر	مرزا احمد علی	۸۰	خاکسار	میر سبحان علی	۱۰۵	رضا	•
۳۱	پاکباز	شاہ ملکھو	۵۶	جوہری	مولوی آیت اللہ	۸۱	خلیق	مرزا ظہور علی	۱۰۶	رفعت	شیخ محمد رفیع
۳۲	پروانہ	سید پروانہ علی	۵۷	جہاندار	مرزا جواں بخت جہاندار شاہ	۸۲	خوب	میر مظہر علی	۱۰۷	رند	مہربان خان
۳۳	پروانہ	راجہ جسونت سنگھ	۵۸	حاتم	شیخ محمد حاتم	۸۳	خیالی	راجہ خیالی رام	۱۰۸	رند	میر ہمزہ (؟) علی
۳۴	پیام	شرف الدین علی خان	۵۹	حامد	میر حامد	۸۴	دانا	شیخ فضل علی	۱۰۹	رنگین	•
۳۵	تاباں	میر عبدالحی	۶۰	•	حبیب اللہ	۸۵	داؤد	داؤد بیگ	۱۱۰	زار	مغل بیگ
۳۶	تائید	خواجہ محمد علی	۶۱	حزیں	میر محمد باقر	۸۶	درخشاں	منگو بیگ	۱۱۱	زار	میر مظہر علی
۳۷	تجرد	میر عبداللہ	۶۲	حسرت	جعفر علی	۸۷	درد	خواجہ میر درد	۱۱۲	زکی	جعفر علی خان
۳۸	تصویر	شاہ جواد علی	۶۳	حسرت	رحمت اللہ	۸۸	درد	کرم اللہ خاں	۱۱۳	ساقی	میر حسین علی
۳۹	تقی	میر تقی معروف میر گھاسی	۶۴	حسرت	میر محمد حیات	۸۹	دردمند	فقیہہ	۱۱۴	سجاد	میر سجاد
۴۰	تمکین	صلاح الدین	۶۵	حسرت	مراد علی	۹۰	دل	فتح محمد	۱۱۵	سراج	میر سراج الدین
۴۱	تمنا		۶۶	حسن	میر محمد حسن	۹۱	دل	محمد عابد	۱۱۶	ثروت؟	مفتی غلام مخدوم

۱۱۷	سعادت	میر سعادت اللہ	۱۴۱	شیدا	میر فتح علی	۱۶۵	عزیز	بھاری داس	۱۸۹	فقیر	میر شمس الدین
۱۱۸	سعادت	میر سعادت علی	۱۴۲	صادق	میر جعفر خان	۱۶۶	عشق	شاہ رکن الدین	۱۹۰	فیض	میر فیض علی
۱۱۹	سکندر	.	۱۴۳	صانع	.	۱۶۷	عشقی	سید ابو الحسن تاناشاہ	۱۹۱	قائم	شیخ محمد قائم
۱۲۰	سلام	نجم الدین علی خان	۱۴۴	صابر	میر محمد علی	۱۶۸	عطا	محمد عطا	۱۹۲	قدر	محمد قدر
۱۲۱	سلیمان	.	۱۴۵	صفدری	.	۱۶۹	عظیم	محمد عظیم	۱۹۳	قدرت	شاہ قدرت اللہ
۱۲۲	سلیمان	سلیمان خان	۱۴۶	.	صمصام الدولہ	۱۷۰	عمدہ	سیتا رام	۱۹۴	قربان	میر جیون
۱۲۳	سلیم	میر محمد	۱۴۷	صنعت	مغل خان	۱۷۱	عمر	معتبر خاں	۱۹۵	قریں	شیخ برکت اللہ
۱۲۴	سودا	مرزا محمد رفیع	۱۴۸	ضاحک	میر غلام حسین	۱۷۲	عیش	مرزا محمد عسکری	۱۹۶	قلندر	غلام قلندر
۱۲۵	سوز	میر سید محمد	۱۴۹	ضیا	میر ضیاء الدین	۱۷۳	غالب	نواب اسد اللہ خان سید الملک	۱۹۷	قلندر	لالہ بدھ سنگھ
۱۲۶	سوزاں	احمد علی خان	۱۵۰	ضیا	مرزا ضیا بیگ	۱۷۴	غریب	میر تقی	۱۹۸	قناعت	مرزا احمد بیگ
۱۲۷	سید	میر امام الدین	۱۵۱	طالع	میر شمس الدین	۱۷۵	غواص	.	۱۹۹	کافر	میر علی نقی
۱۲۸	سید	میر یاد علی	۱۵۲	طپش	.	۱۷۶	فارغ	.	۲۰۰	کاکل	شاہ کاکل
۱۲۹	شاداب	لالہ خوشوقت رائے	۱۵۳	طرز	گردھاری لال	۱۷۷	فخر	میر فخر الدین	۲۰۱	کلیم	شیخ محمد حسین
۱۳۰	شاعر	میر کلو	۱۵۴	ظاہر	خواجہ محمد خان	۱۷۸	فدا	سید امام الدین	۲۰۲	گرفتار	.
۱۳۱	شافی	امین الدین	۱۵۵	ظہور	میر محمد باقر	۱۷۹	فدوی	.	۲۰۳	گریاں	میر علی امجد
۱۳۲	شاکر	محمد شاکر	۱۵۶	ظہور	شیو سنگھ	۱۸۰	فدوی	مرزا محمد علی مشہور بہ مرزا بھجو	۲۰۴	گمان	نظر علی خان
۱۳۳	.	میر شاہ علی خان	۱۵۷	عاجز	عارف علی خان	۱۸۱	فراق	مرتضیٰ قلی خان	۲۰۵	لسان	میر کلیم اللہ
۱۳۴	شاہی	شاہ قلی خان	۱۵۸	عارف	محمد عارف	۱۸۲	فرحت	فرحت اللہ	۲۰۶	لطفی	.
۱۳۵	شفا	حکیم یار علی	۱۵۹	.	مرزا عباس علی	۱۸۳	فرخ	فرخ علی	۲۰۷	مجنون	میر حمایت علی
۱۳۶	شفیع	میر محمد شفیع	۱۶۰	عاشق	میر برہان الدین	۱۸۴	فرحت	مرزا الف بیگ	۲۰۸	مظہر	مرزا جان جاناں
۱۳۷	شورش	میر غلام حسین	۱۶۱	عاشق	علی اعظم خان	۱۸۵	فروغ	میر علی اکبر	۲۰۹	میر	میر محمد تقی
۱۳۸	شوقی	میر حسن علی	۱۶۲	عاشق	میر جی مخاطب عاشق علیخان	۱۸۶	فرہاد	صاحب رائے			
۱۳۹	شہرت	مرزا محمد علی	۱۶۳	عاصی	نور محمد	۱۸۷	فضل	شاہ فضل علی			
۱۴۰	شہید	مولوی غلام حسین	۱۶۴	عزلت	عبد الوالی	۱۸۸	فغاں	اشرف علی خاں			

سید مسعود حسن رضوی

نوٹ: اگر کسی صاحب کے علم میں اس تذکرے کا کوئی مکمل نسخہ کہیں موجود ہو تو براہ کرم سید صاحب کو براہ راست یا ہمایوں کی معرفت جلد از جلد مطلع فرمائیں۔ "مدیر ہمایوں"

فرصت

اگر فکرِ معیشت سے نہ ہو دم بھر کو بھی فرصت
تو ایسی زندگانی میں کہاں گنجائشِ راحت
نہ ہو فرصت کبھی بیٹھیں گھنے جنگل کے سایوں میں
جہاں چرتی ہیں دن بھر گائیں، بھینسیں، بکریاں بھیڑیں
نہ ہو فرصت کہ اک جنگل کا رہرو بھید یہ پائے
کہ ننھے پھل گلہری گھاس میں رکھ کر کہاں جائے
نہ ہو فرصت کہ دیکھیں دن کو اُن چشموں کے نظارے
شعاعیں منعکس جن میں ہیں، جیسے رات کو تارے
نہ ہو فرصت نگاہِ حسن کی دیکھے کوئی شوخی،
ہے رقصِ جانفزا جس کے مستی خُلد کی مے کی
نہ ہو فرصت کہ دیکھیں وہ تبسّم ہونٹ پر آتا،
کیا جو چشمِ مے گونِ صنم نے بارہا پیدا
عجب کیا ہے جو ایسی زندگانی غم سراپا ہو!
سرورِ زندگی کا ذکر ایسے میں بھلا کیا ہو!

(ماخوذ از انگریزی)

شمیم از دینانگر

جادوگر

شہر میں سخت بدامنی کا دور دورہ تھا۔ ہڑتال پر ہڑتال ہو رہی تھی۔

یہ فتنہ کارخانوں سے شروع ہوا اور آہستہ آہستہ آگ کی طرح شہر کے ہر گوشہ میں پھیل گیا۔

اس شورش کو فرو کرنے کے لئے پولیس ہر ممکن کوشش عمل میں لائی۔ مگر بے سود! یہ شورش مٹنے والی نہ تھی۔

شہر اگرچہ پہلے کی طرح گوناگوں دلچسپیوں کا مرقع تھا۔ اس کے بازاروں میں ویسی ہی رونق تھی اور خرید و فروخت حسب معمول جاری تھی مگر باایں ہمہ کوئی شخص بھی یہ کہے بغیر نہ رہ سکتا تھا کہ شہر میں اضطراب کی ایک لہر دوڑ رہی ہے اور معمولی سے معمولی واقعہ ایک عظیم ہیجان کا موجب بن رہا ہے ——— برقنداز کی سیٹی کی آواز لوگوں کے دلوں پر ہیبت طاری کر دیتی تھی۔

اکثر لوگ تو اس سیٹی کی آواز سنتے ہی بھاگ کر جاتے کہ دیکھیں کیا ماجرا ہے لیکن بعض فوراً دکانوں میں چھپ کر پناہ لے لیتے ——— مگر وہ آخر کس سے چھپ رہے تھے؟ ——— وہ کونسی شے تھی جو انہیں اس قدر خوف زدہ کر رہی تھی ——— کسی شخص کو معلوم نہ تھا اور پھر بھی ہر شخص کو ڈر تھا کہ کوئی خوفناک اور ہیبتناک واقعہ ضرور پیش آ کر رہے گا۔

عموماً چیتھڑوں میں ملبوس مزدور بازار میں کھڑے دبی زبان سے باتیں کرتے نظر آتے ——— راستہ چلتے ہوئے وہ امیر لوگوں کی طرف تحقیر آمیز منتقم نگاہوں سے دیکھتے مگر اس کے برعکس امیر ان کے زرد اور غلیظ چہروں کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھتے تھے۔

ایسے شخص ناخواندہ مہمانوں کی طرح شہر کے بارونق بازاروں میں آوارہ چکر لگاتے گمان سے کوئی شخص ہمکلام نہ ہوتا کہ مبادا اس سے اُن کے جسم بھی ویسے ہی غلیظ ہو جائیں ——— لیکن جونہی کسی برقنداز کی ان پر نگاہ پڑ جاتی وہ عوام کے دلوں میں ارتعاشِ خفی پیدا کرتے ہوئے مختلف سمتوں میں بھاگ جاتے تھے۔

"امّی! یہ مزدور ہیں کیا؟"

"ہاں ہاں . . . لیکن تم چلتے جاؤ اور پیچھے مڑ کر نہ دیکھو۔"

"لیکن امّی! وہ بھاگ کیوں رہے ہیں؟"

"پولیس سے ——— دیکھو اب ایسی باتیں نہ کرو"

"لیکن کیوں؟ کیا انہیں سڑک پر چلنے کا حکم نہیں؟"

"انہیں اجازت نہیں۔"

"انہیں اجازت کیوں نہیں؟"

"خدا کے لئے مجھے تنگ نہ کرو ——— اپنا ہاتھ میرے ہاتھ میں دو۔ اور جلدی جلدی چلنے کی کوشش کرو ——— ورنہ ہمیں بھی کسی برقنداز کا کوڑا ———"

"سرگ نے اپنی ماں کا ہاتھ پکڑ لیا اور اس کے ساتھ دوڑنا شروع کر دیا —— مزدوروں کے گروہ کے منتشر ہونے پر سرگ کی ماں سخت خوفزدہ ہوگئی تھی اس کی اُس وقت یہی خواہش تھی کہ کسی طرح وہ اپنے مکان میں جلد پہنچ جائے۔

"کیا یہ مزدور شریر ہیں۔ امیّ!"

"کون؟ کون؟"

"مزدور؟"

"مجھے معلوم نہیں —— وہ اچھے بھی ہیں اور بُرے بھی۔ مگر وہ کام ہی نہیں کرتے۔"

"کیا وہ سست ہیں؟"

"ہاں! ہاں! —— مگر تم ٹھہرو مت —— اور اُن کی طرح سست نہ بنو۔"

"کیا وہ بُرے ہیں امی"؟

وہ ابھی جواب دینے بھی نہ پائی تھی کہ چند گھوڑسوار سپاہی بازار میں نمودار ہوئے ان میں سے ایک نے اپنے گھوڑے کے ایک کوڑا رسید کیا —— کوڑے کی آواز سرگ کی ماں کے کانوں میں اس طرح گونجی جیسے بندوق کی آواز —— وہ چلائی اور بغیر کرایہ طے کئے سرگ کو ایک گاڑی میں دھکیل کر کوچوان کی طرف دیکھتے ہوئے خوفزدہ لہجے میں کہا "جلدی کرو —— جہاں تک جلدی ہو سکے۔"

"مگر کہاں مادام؟ کوچوان نے مودبانہ لہجہ میں کہا۔

"تم سیدھے چلے چلو —— آہ اے میرے خدا! —— جلدی چلو!!"

"خوف مت کیجئے مادام! وہ ہمیں ہاتھ تک نہیں لگائینگے۔"

جب گاڑی بازار کا پہلا موڑ مڑی تو سرگ کی ماں کی جان میں جان آئی اور اطمینان کا سانس لے کر بولی۔

"دیکھو —— میں تمہیں ساڑھے چار آنہ سے زیادہ کرایہ نہیں دینے کی"

"مگر یہ مناسب کرایہ نہیں محترمہ!!"

"تو پھر گاڑی کو یہیں ٹھہرالو —— ہم ٹریم کار میں گھر چلے جائیں گے۔"

"بہت بہتر مادام۔ مگر مجھے ڈر ہے کہ آپ کو بے فائدہ وقت ضائع کرنا پڑے گا —— ٹریم کاریں آج نہیں چلیں گی۔"

"کون کہتا ہے؟"

"میں نے کل سنا تھا کہ ٹریم کار چلانے والے مزدور اتوار کو ہڑتال کر رہے ہیں"

اسی اثنا میں مزدوروں کا گروہ گاڑی کے قریب سے گذرا —— سرگ کی ماں پھر خوفزدہ ہوگئی اور کوچوان کو اشارہ کیا کہ وہ گاڑی کو پھر چلا دے۔

سرگ اپنی ماں کی گود میں بیٹھا ہوا اس گروہ کی طرف خوفزدہ نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ پولیس ان لوگوں کے لئے اتنی پریشان کیوں ہو رہی ہے اگر وہ کام کرنے سے انکار کرتے ہیں تو کریں —— کچھ عرصہ کے بعد وہ بھوک سے تنگ آکر خود ہی سیدھے ہو جائیں گے۔"

کوچوان نے اپنی گھنی داڑھی کو کھجلاتے ہوئے کہا۔

"آپ درست فرما رہی ہیں مادام! ——— آپ ایک حیوان کو فاقہ کشی کے حربہ سے مطیع کر سکتی ہیں اور یہی حربہ انسان کے لئے بھی استعمال ہو سکتا ہے ——— مگر ایک غریب انسان کو اس طرح آزار پہنچانا گناہ ہے ——— گناہ کبیرہ"۔

کچھ دیر خاموش رہ کر کوچوان پھر سرگ کی ماں کی طرف متوجہ ہوا اور بولا۔

دیکھئے آپ ایک قیمتی چغہ پہنے ہوئے ہیں اور میں ایک بھدا کوٹ ——— مگر یہ بتائیے ان دونوں چیزوں کو تیار کرنے والا کون ہے؟

"اس کے متعلق زیادہ غور و فکر کی ضرورت نہیں۔ اگر تمہارے پاس بھی روپیہ ہو تو تم بھی ایسے قیمتی کپڑے پہن سکتے ہو۔ اگر ہمارے آدمی کام نہیں کریں گے تو کیا غیر ممالک سے چیزیں منگائی نہیں جا سکتیں؟"

"لیکن اگر ذرائع آمد و رفت ہی بند ہو گئے تو یعنی اگر ریلوے کے مزدوروں نے بھی ہڑتال کر دی تو پھر آپ وہ چیزیں کہاں سے منگوائیں گی؟"

"ایسا خیال کرنا محض بے وقوفی ہے ——— حکومت کیا ایسا کرنے کی اجازت دے گی؟"

معلوم نہیں مادام! مگر میں نے سنا ہے کہ ریل والے بھی عنقریب ہڑتال کرنے والے ہیں"۔

سرگ اپنی ماں اور کوچوان کی گفتگو بڑے غور سے سن رہا تھا۔ وہ سب کچھ سن کر سخت حیران تھا کہ وہ لوگ جو دوسروں کے لئے کپڑے اور دیگر اشیا تیار کرتے ہیں بازاروں میں پولیس سے

اس طرح کیوں بھاگے پھرتے ہیں۔ اس کی ماں نے ابھی ابھی اسے ایک نیا کوٹ خرید کر دیا تھا جو اس وقت اس کے گھٹنوں پر کاغذ میں لپٹا ہوا پڑا تھا۔ سرگ اس بات پر بہت خوش تھا کہ اس کی ماں نے اسے کپڑوں کی ہڑتال سے پہلے ہی یہ کوٹ خرید دیا۔

"امی! کیا میرا کوٹ بھی انہوں نے ہی تیار کیا ہے؟"

"ہر ایک چیز! ننھے میاں ——— ہر ایک چیز انہی کی تیار کردہ ہے؟ آپ کے جسم پر کوئی بھی ایسی شے نہیں جو انہوں نے تیار نہ کی ہو"۔

کوچوان نے ماں کے بجائے جواب دیا

ماں نے سرگ کے ہاتھ کو جھٹکا دیتے ہوئے سخت غصہ کے لہجہ میں کہا "زیادہ بک بک نہ کرو سرگ! تمہیں کوچوان سے گفتگو نہیں کرنی چاہیئے"۔

مگر کوچوان چپ نہ ہوا اور اسی موضوع پر بہت دیر تک اپنے خیالات کا اظہار کرتا رہا۔

"معلوم نہیں وہ تمہیں گرفتار کیوں نہیں کرتے؟" سرگ کی ماں نے کوچوان سے مخاطب ہو کر یہ الفاظ نہایت درشت لہجے میں کہے

اس پر کوچوان چپ ہو گیا اور تمام راستہ اس بارے میں کوئی گفتگو نہ کی۔

سرگ خیالات کا ہجوم لئے گھر میں داخل ہوا ——— وہ ہنوز یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ مزدور بُرے ہیں یا اچھے۔

"سرگ نے اپنی بہن سے پراسرار لہجہ میں کہا "سونیا! آج ہم نے مزدور دیکھے"۔

"وہ کیسے ہوتے ہیں سرگ؟"

"وہ ——— وہ کسانوں کی طرح ہیں میرے خیال ہیں"
گھر میں ان لوگوں کے متعلق جنہوں نے کارخانوں کو بند کردیا تھا اور کام کرنے سے انکار کرتے تھے روز گفتگو ہوتی مگر سرگئی اس گفتگو سے بھی کوئی نتیجہ برآمد نہ کرسکا۔ وہ تاحال وثوق سے نہ کہہ سکتا تھا کہ آیا وہ لوگ بُرے ہیں یا اچھے۔
ایک روز اس نے اپنے خادم اگنیش سے دریافت کیا:۔
"کیا یہ لوگ کارخانے کو بند کرسکتے ہیں"۔
"بہت آسانی سے۔ ننھے میاں!"
"لیکن کس طرح؟"
"بس وہ کام کرنے سے انکار کردیتے ہیں"۔
"لیکن اُن کے بغیر کارخانہ چل ہی نہیں سکتا کیا؟"
"کارخانے کس طرح چلیں ننھے آقا! جبکہ اُن کے بغیر کوئی کام ہی نہیں ہوسکتا"۔
"اچھا تو یہ بات ہے! اسی طرح میرا نیا کوٹ بھی اُن کے بغیر تیار نہ ہوسکتا؟"
"یقیناً!"
"اور میرا چھوٹا کوٹ بھی"
"چھوٹا کوٹ، پاجامہ اور قمیص بھی ——— اگر وہ یہ سب چیزیں تیار نہ کرتے تو آپ ویسے ہی ہوتے جیسے قدرت نے آپ کو پیدا کیا تھا"۔
"بالکل عریاں! ——— بیوقوف آدمی! ——— مگر میری امّی مجھے دوسرے ملک سے کپڑے منگوا دیتیں"۔
"مگر اس طرح آپ کو بہت انتظار کرنا پڑتا ——— لیکن اگر وہاں بھی اسی طرح ہڑتال ہوتی ——— یا اگر ذرائع آمد و رفت ہی بند ہو جاتے تو ——؟"
"ریل گاڑیاں بھی بند ہو جائیں گی؟"
"افواہ تو یہی ہے"۔
"تو پھر میرے ابا کس طرح آئینگے؟ میں اُن سے کس طرح مل سکونگا؟"
"اس حالت میں انہیں پیدل سفر کرنا پڑیگا"
"خبردار! جو ایسی بات منہ سے نکالی ——— میں امّی سے کہہ دونگا کہ تم میرے ابا کی نسبت ایسے الفاظ استعمال کررہے تھے"۔
یہ کہہ کر سرگئی تھوڑی دیر کے لئے چپ ہو گیا اور کچھ سوچنے لگا لیکن چند منٹ کے بعد ہی اپنے کوٹ کی آستین کو پکڑ کر کہنے لگا
"اور تم کہوگے یہ آستین بھی انہی کے ہاتھ کی سلی ہوئی ہے"
"کیوں نہیں؟ ——— آپ کی والدہ نے صرف آپ کو جنم دیا ہے ——— باقی ———"

دو دن کے بعد ٹریم کاریں چلنی بند ہو گئیں ——— اخبار شائع نہ ہوئے ——— غسلخانوں پر قفل لگ گئے۔ وہ بازار جو گیس سے بقعۂ نور بنے ہوئے ہوتے تھے اب سخت تاریک ہو گئے۔
اس کے دو دن بعد ریل گاڑیوں کی آمد و رفت بھی یک لخت بند ہو گئی جس سے شہر میں سخت ہیجان برپا ہو گیا۔ سرگئی کے ابا کبھی کے آگئے ہوتے مگر گاڑیوں کے بند ہو جانے سے وہ گھر نہ پہنچ سکے اس واقعہ نے گھر بھر کو سخت بےچین کر دیا۔
اب سرگئی کو صحن میں کھیلنے کی اجازت نہ تھی اس لئے وہ سارا دن کھڑکی میں بیٹھا بازار کے واقعات کو غور سے دیکھتا رہتا
"سرگئی نے ایک روز اپنی ماں سے پوچھا" کیا ابا گھر

نہیں آئیں گے امی"۔

"وہ مجبور ہیں سرگ — گاڑیوں کی آمد و رفت بھی بند ہو"۔

"امی! کیا یہ مزدور جو چاہیں کر سکتے ہیں؟"

"کیا؟"

"میرا مطلب یہ ہے کہ آیا یہ لوگ گاڑیوں کی آمد و رفت بھی بند کر سکتے ہیں؟"

"واقعات تو یہی بتا رہے ہیں — مگر تم مجھے بتاؤ مت" یہ کہتے ہوئے سرگ کی ماں کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ ۔ ۔ ۔

یہ دیکھ کر سرگ خاموش ہو گیا اور پھر کھڑکی سے بازار کی طرف جھانکتے ہوئے کہنے لگا۔" اگر میرے بس میں ہو — تو میں ان مزدوروں کو ایک ایک کر کے جان سے مار ڈالوں"۔

شہر کی حالت روز بروز بد سے بدتر ہو رہی تھی۔ صورتِ حالات لحہ بہ لحہ نازک ہو رہی تھی۔

اب بازاروں میں وہ پہلی سی رونق نہ رہی — بہت سی دکانوں میں تالے پڑ گئے — بازاروں میں رات کو مسلح پولیس نے گشت لگانا شروع کر دیا تاکہ شہر میں کوئی شورش برپا ہونے نہ پائے۔

ایک روز نصف شب کے قریب بازار میں اس قدر شور ہوا کہ سرگ اپنے بستر سے برہنہ پا بھاگ کر کھڑکی کے پاس جا کھڑا ہوا گیا تاکہ معلوم کرے یہ شور کیسا ہے۔

کیا دیکھتا ہے کہ بازار میں آگ کا ایک بڑا سا الاؤ جل رہا ہے جس کے ارد گرد لوگ وحشیوں کی طرح چل پھر رہے ہیں۔ سرگ نے سوچا کہ یہ چیزیں ضرور کسی خوفناک واقعہ کا پیش خیمہ ہیں۔ اس خیال نے اس کی رگوں میں خون منجمد کر دیا۔ اور یہ خیال کر کے کہ وہ جن بھوتوں کی طرح اسے آگ پر بھون کر کھا جائیں گے وہ اس قدر خوفزدہ ہوا کہ چلا اٹھا" امی! امی!! مجھے سخت ڈر لگ رہا ہے"۔

"سرگ کی ماں نے نیند سے بیدار ہوتے ہوئے کہا "سرگ! تم سوتے کیوں نہیں؟ جاؤ اپنے بستر پر لیٹو"۔

"امی! دیکھو بازار میں آگ جل رہی ہے — مجھے اس آگ سے سخت ڈر لگ رہا ہے"۔

"جاؤ سرگ اپنے بستر پر جا لیٹو — یہ آگ واگ کچھ بھی نہیں — کاش! تمہارے ابا یہاں موجود ہوتے"۔

"امی! ———"

"ہاں! میرے بچے"۔

"میں آپکے پاس آ جاؤں؟ — مجھے خوف معلوم ہوتا ہے"

"کس سے میرے پیارے؟"

"جادوگروں سے امی"۔

"وہ کون جادوگر؟"

"بہت سے جادوگر ہیں امی — مختلف قسم کے جادوگر"

"تو پھر میرے پاس آ جاؤ"۔

سرگ خوشی خوشی اپنی ماں کے پاس جا لیٹا اور اپنے آپ کو لحاف میں چھپا کر کہنے لگا" امی! یہ لوگ سب کچھ کر سکتے ہیں" اس کی ماں تو تھوڑی دیر کے بعد سو گئی مگر سرگ لحاف سے منہ نکال کر سوچنے لگا کہ یہ لوگ برے ہیں یا اچھے مگر کوئی قابلِ اطمینان نتیجہ نہ نکال سکا۔

دوسرے روز صبح کو جب سرگ کو ناشتہ ملا۔ تو اس کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب گرم گرم توس کے بجائے اس نے میز پر سخت اور ٹھنڈی روٹی کے ٹکڑے دیکھے۔

سرگ نے خشک روٹی کے ٹکڑوں کو میز سے ہٹاتے ہوئے کہا "مجھے بسکٹ لا کر دو! میں ایسی فضول چیز نہیں کھانے کا!!"

نوکر نے سرگ کو سمجھاتے ہوئے کہا "ننھے آقا! آپ کو خدا کا شکر کرنا چاہیئے کہ ہمارے ہاں یہ خشک روٹی بھی موجود ہے"

"کیا کہا؟ جاؤ جاؤ یہ اٹھا لے جاؤ ــــ امی! امی!! مجھے بسکٹ لا کر دو"

"سرگ پیارے! میں تمہیں بسکٹ کہاں سے لا کر دوں۔ بسکٹ بنانے والے کارخانے ہی بند ہیں"

پھر وہی مزدور۔ سرگ ان مزدوروں کی حرکات سے تنگ آگیا تھا تنک کر بولا:۔ "مگر بسکٹوں کے بغیر صبح کا ناشتہ کیسے ہوگا؟"

"ہم کوشش کریں گے کہ کہیں سے بسکٹ دستیاب ہو سکیں"

"کیا گورنر انہیں مجبور نہیں کرسکتا کہ وہ بسکٹ تیار کریں؟"

"سرگ پیارے! گورنر بیچارہ کیا کرے۔ وہ تو کسی کا بھی حکم نہیں مانتے"

سرگ نے حیران ہو کر پوچھا "گورنر کا حکم نہیں مانتے؟"

"وہ گورنر کیا کسی کا بھی حکم نہیں مانتے"

"تو پھر وہ گورنر سے بھی بڑے ہوئے نا!!"

"سرگ ان باتوں کو چھوڑو اور خدا کا شکر کر کے یہ روٹی کھا لو"

"میں تو ایسی بھدی روٹی نہیں کھانے کا"

"مگر تمہیں مجبوراً کھانی پڑے گی"۔

"وہ کیوں؟"

سرگ کی حیرانی لحظہ بہ لحظہ اور روز بروز بڑھتی چلی گئی۔ وہ سخت حیران تھا کہ وہ لوگ جو کارخانوں کو چشم زدن میں بند کر سکتے ہیں۔ جو گورنر تک کا حکم نہیں مانتے پولیس سے اس طرح کیوں بھاگے پھرتے ہیں۔

اُس نے خیال کیا کہ یہ لوگ ویسے ہی جادوگر ہیں جن کا حال میں عموماً کہانیوں میں پڑھا کرتا ہوں اور یہ کہ ان کے پاس بھی ان جادوگروں کی طرح ایسی ٹوپیاں ہونگی جن کے پہننے سے وہ غائب ہو جاتے ہوں گے۔

جب گورنر ان سے کام کو کہتا ہوگا تو وہ جھٹ ٹوپی پہن گورنر کی آنکھوں سے غائب ہو جاتے ہوں گے۔

بے چینی کی لہر آہستہ آہستہ بازاروں میں سے ہوتی ہوئی ان سربفلک محلات میں بھی داخل ہوگئی جن کے ساکنوں نے آج تک مصیبت اور تکلیف کا نام تک نہ سنا تھا۔

اب ان محلوں میں وہ پہلی سی شان وشوکت نہ رہی۔ خوشی کے نغمے اور قہقہے جن سے اُن کی دیواریں ہمیشہ گونجا کرتی تھیں ــــ آہستہ آہستہ غائب ہوگئے۔ اب اُن کی جگہ ایک نامعلوم خوف نے لے لی۔ وہ جن کے کان خوف سے بالکل ناآشنا تھے اب ہر وقت کسی نامعلوم خوف سے ہراساں رہنے لگے۔ وہ شخص جو ناز و نعمت کے عادی تھے اب مجبوراً روکھی سوکھی روٹی پر گزارہ کرنے لگے ایسے افراد میں سرگ کے والد کا بھی شمار تھا۔

ایک روز شام کے قریب سرگ کے گھر میں بجلی کی رو

بند ہوگئی۔

سرگ نے اپنی والدہ سے کہا "امّی! معلوم ہوتا ہے بجلی گھر کا انجن خراب ہوگیا ہے"۔

"ملاقات کے کمرے کا لیمپ تو جلا کر دیکھو"۔

"امّی! اُس کمرے کا کیا، کوئی لیمپ بھی نہیں جلتا"۔

"کیا بجلی گھر میں بھی تو ہڑتال نہیں ہوگئی ؟"

خادم آگنیش نے کہا "جی ہاں! میں نے سنا ہے کہ بجلی گھر والوں نے کام کرنے سے انکار کر دیا ہے"۔

"آگنیش! دیکھو گھر میں موم بتیاں ہیں ؟"

"جی ہیں! مگر بہت تھوڑی"۔

اب اُسی گھر میں جو بجلی کی روشنی سے بقعہ نور بنا ہوتا تھا —تاریکی— قیامت کی تاریکی مسلط تھی— ہال میں بجلی کے قمقموں کے بجائے موم بتی کی زرد روشنی ٹمٹما رہی تھی اس روشنی کے گرد سرگ اور اُس کی ماں دونوں بیٹھے دن کے واقعات پر غور کر رہے تھے کہ باورچی خانہ سے خدام تازہ خبر لائے کہ تھوڑے دنوں کے بعد نلوں میں پانی آنا اور گوشت بکنا بند ہو جائے گا۔

سرگ ان ہوشربا خبروں کو حیرت و استعجاب کی تصویر بنا ہوا سن رہا تھا اب اس کے ننھے دماغ پر یہ خیال پوری طرح مسلط ہوگیا کہ مزدور لوگ ضرور جادوگر ہیں —بہت بڑے جادوگر— جو حرف الہ دین کے چراغ ہی سے مطیع ہو سکتے ہیں۔

اگر یہ جادوگر چاہیں تو ایک اشارے سے ریل گاڑیاں چلنی شروع ہو سکتی ہیں اس کا باپ فوراً گھر آ سکتا ہے اُن کے حکم سے بجلی کی رو پھر واپس آ سکتی ہے اور کمرے پہلے کی طرح پھر جگمگا سکتے ہیں اور اگر وہ چاہیں تو اُسے ہر روز صبح ناشتے کے ساتھ گرم اور تازہ توس مل سکتے ہیں۔

سرگ نے یہ سب کچھ سوچنے کے بعد اپنے دل میں کہا یہ جادوگر بڑے نڈر ہیں۔

سرگ اس بات کا متوقع بھی نہ تھا جب پندرہ دن کے بعد ایک دن یک لخت کئی معجزے رونما ہوئے یعنی— ٹریم کاریں چلنی شروع ہوگئیں، بجلی کی رو آگئی، اخباروں کی اشاعت از سر نو جاری ہوگئی، صبح کے ناشتے کے ساتھ تازہ توس ملنے لگ گئے، اور اس کا باپ گھر آگیا— غرضکہ اتنی اچھی باتیں بہ یک وقت ہوگئیں۔

ایک روز جب وہ اپنے ابّا کے ساتھ بازاروں میں گھومنے کے لئے گیا۔ تو اس نے خلافِ توقع بہت سے "جادوگروں" کو آزادانہ چلتے پھرتے دیکھا جو ہاتھ میں جھنڈے پکڑے مختلف قسم کے راگ گاتے ہوئے بازاروں میں چکر لگا رہے تھے۔

وہ اب کسی سے خوفزدہ نہ تھے اور نہ اب پولیس ہی انہیں ایسا کرنے سے روک رہی تھی۔ جب سرگ گھر واپس آیا تو اُس نے چاہا کہ اب کی دفعہ اکیلا بازار میں جا کر ان جادوگروں کا تماشا دیکھے

"امّی —میری پیاری امّی! بازار میں جادوگر گزر رہے ہیں۔ کیا میں انہیں دیکھنے جاؤں ؟"

"ہرگز نہیں"!

"امّی! اب تو وہ بُرے نہیں"۔

اسی طرح کئی ماہ گزر گئے— اب پہلے کی طرح امن تھا،

کسی قسم کی شورش یا ہڑتال رونما نہ ہوئی، گھروں میں پھر خوشی کے نغمے اور قہقہے گونجنے لگے اور وہ نامعلوم خوف جو لوگوں کے دلوں پر مسلط ہو گیا تھا رفتہ رفتہ بالکل غائب ہو گیا

ایک روز سرگ بڑا اداس ہو گیا۔ اس کی ماں اور باپ دونوں تھیئٹر میں گئے ہوئے تھے، گھر کی خادمہ کسی کام میں مشغول تھی اور اس کی بہن اپنی گڑیوں میں کھیل رہی تھی سرگ حیران و پریشاں ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں جا رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ وقت کاٹنے کے لئے کیا کروں۔

"دادی اماں! بتائیے میں کیا کروں"۔

"آؤ میرے پاؤں دباؤ"۔

"میں نہیں دباتا ـــ پاؤں دبانے میں کوئی دلچسپی نہیں"

یہ کہہ کر وہ اسی خیال میں مستغرق دوسرے کمرے میں گیا اور اپنی بہن کی نئی گڑیا توڑ ڈالی۔ اس حرکت پر ماما سخت خفا ہوئی اور اس نے اسے کمرے سے باہر نکال دیا۔ اب وہ چاہتا ہے کہ باورچیخانہ میں جا کر نئی باورچن کو دیکھے مگر خادمہ اجازت نہ دیتی تھی اس لئے کہ سرگ کی ماں اس سے کہہ گئی تھی کہ اُسے باورچیخانے میں ہرگز ہرگز نہ جانے دے۔

سرگ نے تنگ آ کر کہا "مگر میں کیا کروں ـ میں اکیلا ہوں"

خادمہ نے سرگ سے پوچھا "کیا تمہارے لئے کوئی اور دلچسپی باقی نہیں رہی؟"

"یہ کون باتیں کر رہا ہے؟"

"باورچن کا خاوند آیا ہوا ہے۔ وہی باتیں کرتا ہوگا"۔

"یہ دلچسپ چیز نہیں تو اور کیا ہے؟"

"وہ دلچسپ کس طرح ہوا؟ وہ معمولی سا آدمی ہے۔ ایک غریب مزدور"۔

"باورچن کا خاوند ایک مزدور؟"

"کیوں؟"

"ایک جادوگر ـــ اب تو میں ضرور اندر جاؤنگا"۔

"سرگ! اگر تم نے ایسا کیا تو میں تمہاری اماں سے کہہ دوں گی کہ تم نے ان کی نافرمانی کی ہے"۔

"تم چغل خور بھی ہو؟ ـــ چغل خور! کہہ کر تو دیکھو میں نے بھی انہیں بتانہ دیا ہو کہ تم نے صبح دودھ پر سے بالائی اُتار کر کھالی تھی"۔

"یہ بالکل غلط ہے ـ میں نے تو دودھ میں سے مکھی نکالی تھی"

سرگ بہت عرصے تک خادمہ سے جھگڑتا رہا مگر اُس نے اُسے باورچی خانے میں جانے کی اجازت نہ دی۔

جب خادمہ کمرے سے چلی گئی تو سرگ نے اطمینان کا سانس لیا اور باورچی خانے کے دروازے کے قریب جا کر اُسے آہستہ آہستہ کھولنا شروع کیا۔ سرگ میں اتنی ہمت نہ تھی کہ دروازہ ایکدم کھول دے اس لئے وہ کچھ عرصہ سانس بند کئے دروازے کے ساتھ لگا رہا۔

تھوڑی دیر کے بعد ہمت کر کے اس نے کمرے کے اندر جھانکا ـــ ایک بھدا سا آدمی میز پر بیٹھا کچھ کھا رہا تھا۔ اس کی حرکات سے معلوم ہوتا تھا گویا وہ ڈر رہا ہے کہ کوئی شخص اس کا کھانا نہ چھین لے۔ اسی لئے وہ دوسرے ہاتھ سے پلیٹ کو مضبوطی سے پکڑے ہوئے تھا۔

سرگ حیران تھا کہ وہ جادوگر کہاں ہے؟ ـــ ایسا بھدا

مزدور اتنا طاقتور جادوگر نہ ہوسکتا تھا۔

اُس نے باورچی خانے کے ہر گوشے میں نگاہیں دوڑائیں مگر اس شخص اور باورچن کے سوا کسی اور کو موجود نہ پایا۔ تو پھر اس کے یہ معنی تھے کہ وہ بدنما شخص ہی جادوگر ہے۔

سرگ اس راز کو معلوم کرنے کے لئے باورچی خانے میں داخل ہو گیا —— جس پر جادوگر اس قدر چونکا کہ اس کے ہاتھ سے پلیٹ گرتے گرتے بچی۔

باورچن نے اپنے خاوند کو تسلی دیتے ہوئے کہا "تم کھانا کھائے چلو —— ننھے آقا تمہیں کچھ نہیں کہیں گے"۔

سرگ نے حیران ہو کر پوچھا۔ "ہیں؟"

"اپنی امی سے مت کہئے کہ یہ شخص شوربا پی رہا تھا —— یہ کھانے سے بچا ہوا تھا ننھے آقا!"

"یہ شخص بہت بھوکا ہے ننھے آقا! آپ کو اس پر رحم کرنا چاہیئے"

"کون؟"

"یہ شخص —— میرا خاوند"

"تمہارا خاوند؟"

سرگ نے اپنے آپ کو یقین دلانے کی خاطر اس شخص کی طرف غور سے دیکھا اور اپنے دل میں کہا "اس جادوگر نے ضرور اپنی شکل تبدیل کر رکھی ہے"۔

اور پھر کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا "تم جادوگر ہو —— مجھے اچھی طرح معلوم ہے تم جادوگر ہو!"

مزدور نے ڈرتے ہوئے پوچھا "کون؟"

"تم اور کون؟"

"میں ایک غریب مزدور ہوں میرے آقا!"

"لیکن تم جادوگر ہو —— مجھے یقین ہے کہ تم جادوگر ہو۔ تم سب کچھ کہہ سکتے ہو۔ یہ سب حرکتیں تمہاری ہی تھیں۔ لیکن دیکھو! اب ایسی حرکات نہ کرنا —— بغیر بجلی کے گھر میں سخت اندھیرا ہو جاتا ہے۔ اور کارخانے بند کرنے سے مجھے بسکٹ نہیں ملتے"۔

"جناب! میں نے تو ایسی حرکت کبھی نہیں کی۔ میں ابھی جاتا ہوں"

"تم مجھے دھوکا دے رہے ہو۔ تم تو کسی سے خوفزدہ ہی نہیں ہوتے۔ میرا خیال تھا کہ تم مکان جتنے بڑے ہو گے مگر معلوم ہوتا ہے تم نے شکل تبدیل کر رکھی ہے"۔

"آپ میرا مذاق اڑا رہے ہیں صرف اس لئے کہ میرے پاس کھانے کو کچھ نہیں اس طرح مذاق کرنا گناہ ہے میرے آقا!"

"میں نے خیال کیا تھا کہ تم بہت سنجیدہ ہو گے مگر معلوم ہوتا ہے کہ تم مسخرے بھی ہو۔ شوربا پیتے وقت تمہارے ہاتھ کانپ رہے تھے اس لئے میں تم سے ذرہ بھر بھی خوفزدہ نہیں"۔

اتنا کہہ کر سرگ باورچی خانہ سے باہر نکل کر دروازہ میں کھڑا ہو گیا تاکہ اگر جادوگر اس کا تعاقب کرے تو وہ جلدی سے گھر میں بھاگ جائے مگر خلافِ توقع جادوگر نے اس کا تعاقب نہ کیا۔

سرگ نے مڑ کر دیکھا تو جادوگر —— ہاں! وہی جادوگر۔ ایک کونے میں کھڑا رو رہا تھا اور اپنے آنسوؤں کو اپنی غلیظ آستین سے صاف کر رہا تھا۔

"ایک جادوگر ہو کر تم رو رہے ہو۔ اچھا ہوا تمہیں ایسی ہی سزا ملنی چاہیئے —— تم نے میرے ابا کو گھر میں کیوں نہ آنے دیا تھا؟ —— تم نے بجلی کی رو کیوں بند کر دی تھی؟ تم نے میرے بسکٹ بنانے کیوں بند کر دیئے تھے؟ —— اب تمہیں خدا نے خوب سزا دی ہے۔ روؤ —— اور خوب روؤ ——"

یہ کہہ کر سرگ خوشی کے نعرے مارتا ہوا گھر میں چلا گیا اور خادمہ کے پاس جا کر کہنے لگا "اب میں اس جادوگر سے نہیں ڈرتا —— ذرہ بھر نہیں ڈرتا"۔

سعادت حسن

(ترجمہ)

نوائے مجاز

کمالِ عشق ہے دیوانہ ہو گیا ہوں میں
اُسی کے ہاتھ سے دامن چھڑا رہا ہوں میں

تمہیں تو ہو جسے کہتی ہے ناخدا دنیا
بچا سکو تو بچا لو کہ ڈوبتا ہوں میں

بتانے والے وہیں پر نشاں بتاتے ہیں
ہزار بار جہاں سے گزر چکا ہوں میں

یہ میرے عشق کی مجبوریاں معاذاللہ!
تمہارا راز تمہیں سے چھپا رہا ہوں میں

تجھے یہ ناز کہ تیرا نشاں نہیں ملتا
مجھے یہ فخر کہ تیرا ہی نقشِ پا ہوں میں

اِس اک حجاب پہ سو بے حجابیاں صدقے
جہاں سے چاہتا ہوں تجھ کو دیکھتا ہوں میں

پھر ایک سلسلۂ نقشِ پا نظر آیا
پھر اپنی دُھن میں کسی سمت جا رہا ہوں میں

کبھی یہ زعم کہ تو مجھ سے چھپ نہیں سکتا
کبھی یہ وہم کہ خود بھی چھپا ہوا ہوں میں

مرا نشاں نہ ملے گا مرا نشاں مت پوچھ
جو کھو گئی ہو فضاؤں میں وہ صدا ہوں میں

مجھے سنے نہ کوئی مستِ بادۂ عشرت
مجازؔ ٹوٹے ہوئے دل کی اک صدا ہوں میں

اسرار الحق مجاز ردولوی

والٹر

والٹر ایک قدآور اور شہ زور جرمن تھا۔ وہ فطرتاً صلح پسند بلکہ بزدل واقع ہوا تھا۔ اس کی شادی ایک نوجوان حسین لڑکی سے ہوئی تھی جس سے اُس کے چار چھوٹے چھوٹے بچے بھی تھے۔ اسے بیوی بچوں سے بیحد محبت تھی۔ وہ سرشام سو جانے اور صبح دیر میں اٹھنے کا عادی تھا۔ پیٹ بھر کر کھانا اور بیوی بچوں میں وقت گزارنا اسے بہت بھاتا تھا۔ یہ پُرلطف خانگی زندگی اسے بے انتہا پسند تھی۔ اور یہ بھی ایک وجہ تھی کہ وہ میدانِ جنگ، بندوق اور سنگین کے نام سے نفرت کرتا تھا۔ وہ فوج کا سپاہی ضرور تھا۔ مگر ان خطرناک جنگی آلوں کے استعمال میں اُس نے کبھی مہارت اور سبکدستی نہ دکھائی۔ بلکہ تمام عمر ان سے دور ہی دور رہا۔

وہ کسی حالت میں بھی مرنے کے لئے آمادہ نہ تھا۔ قطع نظر اپنی ذات کے اُسے کم از کم بیوی بچوں ہی کے لئے زندہ رہنا ضروری تھا۔ دولت مند وہ تھا نہیں، بلکہ اس کی مالی حالت کبھی قابلِ اطمینان نہ رہی۔ خدانخواستہ اگر وہ مارا جاتا تو اس کے بیوی بچوں کا کیا حشر ہوتا۔ الغرض میدان جنگ اور دشمن کا خیال آتے ہی اس کا جسم تھرتھرانے لگتا۔ گولی کی سنسناہٹ اور تلواروں کی جھنکار کے خیال ہی سے اُس کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے۔ اور پھر تو وہ کسی شرط پر بھی میدانِ جنگ میں جانے کے لئے آمادہ نہ ہوتا۔

جب سے جرمن اسکاوٹ کے ہمراہ وہ فرانس کی سرحد میں داخل ہوا اپنی قسمت کو کوستا ہی رہا۔ دراصل اس کی تمام زندگی میں گزشتہ چند ماہ بیحد پریشانی اور خطرے میں گزرے۔ اس مرتبہ بڑی مشکل سے وہ جرمن اسکاوٹ کی ایک مختصر سی جماعت کے ہمراہ سرحدی علاقے میں بھیجا گیا تھا۔ فرانسیسی استحکامات اور سرحدی سرزمین کی کیفیت معلوم کرکے جرمنی اطلاع دینا اس جماعت کا کام تھا۔ اتفاقاً اس وقت تمام علاقے میں خاموشی چھائی ہوئی تھی اور کہیں بھی جنگی فضا کا وجود نہ تھا۔ چنانچہ آخری وقت تک اس جماعت کو کہیں بھی دشمنوں کا سامنا نہ کرنا پڑا۔

ایک صبح یہ جماعت اپنا کام کامیابی سے ختم کرکے جرمنی واپس ہو رہی تھی۔ یکایک ایک طرف سے بندوقوں کی باڑھ چلی اور بیس پچیس آدمی زخمی ہو کر زمین پر آرہے۔ پلک جھپکتے ہی فرانسیسیوں کا ایک مختصر سا دستہ قریب کے جنگل میں سے نکل کر حملہ آور ہوا اور پھر جلد ہی دست بدست جنگ شروع ہوگئی۔ یہ خونریز سماں دیکھ کر والٹر بدحواس ہوگیا۔ اس کا جسم کانپ رہا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ زمین نے اس کے پیر پکڑ لئے ہیں اور وہ چل نہیں سکتا۔

مگر فوراً ہی اُس نے رُخ پھیرا اور بے تحاشا بھاگنا شروع کیا۔ کچھ دور جانے کے بعد اُسے سامنے ہی ایک طول طویل خندق

دکھائی دی جو خشک جھاڑیوں سے ڈھکی ہوئی تھی۔ والٹر بے توقف اس میں کود پڑا اور جلد ہی گھاس پھوس اور جھاڑیوں میں سے ہوتا ہوا تہ میں پہنچ گیا۔ اس کا منہ اور سارا بدن لہولہان ہوگیا ایک نوکیلے پتھر سے اُس کے سر میں چوٹ بھی آگئی۔ مگر اس وقت اسے اس کی بھی پروا نہ تھی۔ اس وقت تو فرانسیسیوں کی نگاہ سے بچ کر نکل جانا ہی غنیمت تھا۔ اس نے جھاڑیوں میں سے آہستہ آہستہ رینگنا شروع کیا اور اس طرح تھوڑی دیر میں وہ میدانِ جنگ سے بہت دور نکل گیا۔ یہاں پہنچ کر اس نے اطمینان کا سانس لیا۔ مگر جیسے ہی اس نے نگاہ اٹھا کر اوپر دیکھا اسے نیلا نیلا آسمان دکھائی دیا اور ساتھ ہی وہ سر سے پیر تک کانپ اٹھا۔ کیا میں یہاں بھی محفوظ نہیں ہوں؟ خوش قسمتی سے قریب ہی کھائی میں ایک طرف چھوٹا سا غار دکھائی دیا اور والٹر جلدی سے اس میں ہو رہا۔

آہستہ آہستہ دن ڈھلتا گیا اور شام ہو چلی۔ تاریکی چاروں طرف پھیلنے لگی۔ اب تو والٹر نے پریشان ہو کر سوچنا شروع کیا کہ رات کہاں بسر کی جائے۔ کیا فوج میں واپس چلوں اور پھر ہی بندوق، وہی سنگین وہی تلوار؟ نہیں! اور پھر بھاگے ہی کیوں تھے"؟ آس پاس پتیوں میں کچھ کھڑکھڑاہٹ ہوئی اور ایک مرتبہ وہ پھر کانپ گیا۔ کہتے ہیں "مصیبت تنہا نہیں آتی"۔ دیکھئے نا فرانسیسیوں کا ڈر، پتھر کی چوٹ، کانٹوں کی خراش ہی کیا کم تھی کہ غریب سپاہی کو بھوک پیاس نے بھی ستانا شروع کیا۔ والٹر ان لوگوں میں سے نہ تھا جو ہوا پی کر زندہ رہ سکتے ہیں اور نہیں تو پیٹ ہی بھرنے کے لئے اسے اس محفوظ خندق کو مجبوراً چھوڑنا تھا۔ مگر ہموطنوں سے دور دشمن کے ملک میں تن تنہا۔ اور اس پر غضب یہ کہ فوجی وردی میں جرمن سپاہی۔ اس خیال ہی سے اس کے ہوش و حواس غائب ہوگئے۔

یک بہ یک اسے خیال آیا کہ کیوں نہ جنگی قیدی بن جاؤں۔ مزے سے پیٹ بھر کھانے کو ملے گا اور پھر بے مشقت میدان جنگ سے دور، گولی بارود سے محفوظ۔ ایک بے خطر قید خانے میں بس بس چلو فرانسیسی کیمپ میں چل کر گرفتار ہو جاؤں۔ لیکن اگر کہیں کچھ فرانسیسی گھات لگائے راستے ہی میں بیٹھے ہوں اور جرمن جاسوس سمجھ کر نکلتے ہی حملہ کر دیں؟ یا اگر کسانوں نے دیکھ پایا کہ ایک جرمن وردی پوش سپاہی اور وہ بھی تن تنہا۔ توبہ ارے وہ تو کتے کی موت مار ڈالیں گے۔ اور اپنی پے در پے ہزیمتوں کا بدلہ ایک جرمن سپاہی سے دل کھول کر نکالیں گے۔ ارے غضب اور پھر میری غریب بیوی اور پیارے بچوں کا کیا حشر ہوگا؟ اور پھر دشمن کے کیمپ میں وردی پہن کر جانا بھی تو خطرناک ہے کہیں کوئی پہلی ہی نظر میں فیر کر دے تو کیا ہو۔ تو پھر قیدی کیسے بنوں"۔

غریب سپاہی نہ معلوم کب تک اسی ادھیڑبن میں مصروف رہا مگر اب دوسری مصیبتیں سر پڑیں، رات بھیگ چکی تھی اور ہر طرف ناقابل برداشت تاریکی چھا گئی تھی۔ یہ ہیبت ناک خاموشی اور تاریکی دیکھ کر اس کی نبض چھوٹ چلی تھی۔ اور اب تو اس نے ڈر کے مارے ہلنا جلنا بھی چھوڑ دیا تھا کسی طرف سے ایک چمگادڑ اڑتی ہوئی آئی اور اس کے سر سے ٹکرا کر گری اور بس اس کی جان ہی تو نکل گئی! ایک مرتبہ ایک لومڑی پاس ہی سے بھاگتی ہوئی نکل گئی اور اس نے اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنا شروع کیا کہ کہیں کوئی فرانسیسی تو نہیں آ رہا ہے۔ اتنے میں سرد ہوا کے جھونکے چلنے لگے اور غریب سپاہی ایک مرتبہ پھر سکڑ کر اپنے غار میں بیٹھ رہا۔ بیچارے نے تمام

رات اسی کرب اور بےچینی میں گزاری۔

علی الصباح جب کچھ روشنی ہوئی تو اس نے اطمینان کا سانس لیا۔ اس کے ہاتھ پیر ڈھیلے ہوگئے اور سر زانو سے لگ گیا جلد ہی وہ بے خبر ہو کر سو گیا جب آنکھ کھلی تو سورج سر پر چمک رہا تھا اور اسے بیحد بھوک لگی ہوئی تھی۔ اُبلے ہوئے آلو۔ بھنے ہوئے گوشت اور فرانسیسی شراب کا خیال آتے ہی اُس کی آنتوں میں درد سا ہونے لگا۔ اس نے کوشش کر کے سر سے خود اتارا' اور بڑی احتیاط سے سر خندق کے باہر نکال کر ادھر ادھر دیکھا۔ ہر طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ دور افق تک نہ کوئی آدم نہ آدم زاد۔ البتہ ایک طرف دور بہت دور ایک چھوٹا سا گاؤں ضرور دکھائی دے رہا تھا۔ جھونپڑوں کی چمنیوں سے دھواں نکل نکل کر بتا رہا تھا کہ دوپہر کا کھانا بس تیار ہی ہے مگر اسے اب بھی باہر نکلنے کی جرأت نہ ہوئی۔ رات آئی اور ختم ہوگئی۔ تمام شب وہ پُرلطف کھانوں اور شراب ہی کا خواب دیکھتا رہا مگر صبح سویرے وہی بھوک اور اب بھی اسی خندق میں۔

تیسرا دن بھی گزر گیا اور اب تیسری رات آگئی۔ وہ ڈرا کہ کہیں فاقہ کشی کرتے کرتے مر نہ جاؤں۔ اُس نے تصوّر کیا کہ وہ مر گیا ہے۔ اس کی لاش خندق میں پڑی ہے۔ مردار خور جانور نوچ نوچ کر اس کا گوشت کھارہے ہیں۔ پاس ہی دو کتے اس کی ہڈیوں پر غرا رہے ہیں۔ یہ سوچتے ہی وہ کانپ اٹھا۔ آہ! میں یہ ذلیل موت نہیں مروں گا۔ اور پھر میں شہادتِ ملّی کے اعزاز سے بھی تو محروم ہی رکھا جاؤں گا۔ کیا میں میدان جنگ سے بے انتہا دور نہیں نکل آیا ہوں۔ اور پھر مجھے کوئی گہرا زخم بھی تو نہیں لگا۔" وہ ڈرا کہ کہیں بھوک پیاس کی شدت سے بیہوش نہ ہو جائے کہ پھر اس کا اس خندق سے نکلنا معلوم اس نئے خیال سے وہ اتنا خوفزدہ ہوا کہ اس نے خندق سے نکل بھاگنے ہی کی ٹھہرائی۔ مگر ابھی ارادہ ہی کیا تھا کہ پاس ہی چند دیہاتیوں کی آوازیں سنائی دیں۔ اب تو وہ آناً فاناً پھر اسی غار میں اور بالکل بےحس وحرکت۔ خیریت ہوئی کہ وہ دوسری طرف مڑ گئے۔ ورنہ بیچارے کی بے بلائے موت آجاتی۔

مگر جب رات زیادہ گزر گئی اور ہر طرف خاموشی چھا گئی تو اس سے نہ رہا گیا۔ گاؤں یا کیمپ جانے کی تو اب بھی اُسے جرأت نہ ہوئی۔ چار و ناچار اس نے قلعے کی راہ لی۔ کہ وہاں نسبتہً کم خطرہ تھا۔ چھپتا چھپاتا نہایت احتیاط اور بڑی خاموشی کے ساتھ وہ قلعے کے پاس جا پہنچا۔ خیریت ہوئی کہ راستے میں کوئی حادثہ پیش نہ آیا۔ اس وقت اس قلعے کی کھڑکیوں میں سے نہایت تیزی سے روشنی باہر نکل رہی تھی اور اتفاقاً ایک کھڑکی بالکل کھلی ہوئی تھی جس میں سے بھنے ہوئے گوشت کی سوندھی سوندھی خوشبو باہر نکل رہی تھی۔ تھوڑی دیر کے لئے والٹر تمام خطرے بھلا بیٹھا اور کھڑکی میں سے بے اختیار اندر جست کر گیا۔ یہ باورچی خانہ تھا اور بالکل خالی۔ پاس ہی دوسرے کمرے میں آٹھ دس آدمی ایک لمبی سی میز کے گرد اگرد بیٹھے ہوئے مزے لے لے کر کھانا کھا رہے تھے۔ والٹر جھانک کر انہیں دیکھ ہی رہا تھا کہ اچانک ایک عورت کی نگاہ اس پر پڑ گئی۔ اور فوراً اس کے ہاتھ سے گلاس چھوٹ کر زمین پر گر پڑا۔

اس نے اس کی طرف اشارہ کرکے چلانا شروع کیا۔ "دیکھو وہ دیکھو جرمن حملہ کر رہے ہیں"۔ یکے بعد دیگرے سب کی نگاہیں اُس کی طرف اٹھیں اور بدحواس ہو کر سب نے چلانا اور بھاگنا شروع کیا۔ عورتیں مرد اور بچے۔ ایک کے پیچھے ایک۔ گرتے پڑتے ایک لمحے میں سب دروازے کی طرف بھاگے اور دوسرے لمحے میں کمرہ خالی تھا۔

میز پر لذیذ کھانوں سے بھری ہوئی پلیٹیں بدستور پڑی تھیں اور والٹر تین شبانہ روز کا بھوکا تھا۔ وہ بے صبری کے ساتھ آگے بڑھا اور چاہتا تھا کہ سارا کھانا ایک ساتھ نگل جائے۔ مگر باہر کی بھاگ دوڑ سن کر ایک میز کے نیچے چھپ کر بیٹھ رہا۔ تھوڑی دیر میں شور و غل بند ہوا۔ معلوم ہوتا تھا تمام لوگوں نے سانس روک لی ہے۔ البتہ کچھ دور دوسری طرف لوگوں کے زینے سے نیچے اترنے کی آواز ضرور آرہی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ سب لوگ تہ خانے میں گھس رہے ہیں! اور جب ہر طرف موت کا سناٹا چھا گیا تو والٹر میز کے نیچے سے نکلا اور جھپٹ کر کھانا بلکہ نگلنا شروع کیا۔ اندیشہ تھا کہ کہیں فرانسیسی آکر کھانا چھین نہ لیں اس لئے وہ دونوں ہاتھوں سے اٹھا اٹھا کر ہر چیز بڑی تیزی سے نگل رہا تھا! اور جب تمام پلیٹیں صاف ہو گئیں تو اُس نے کرسی سے پیٹھ لگا کر کوٹ کے بٹن کھولے اور شراب کی کئی بوتلیں خالی کر ڈالیں۔ آہستہ آہستہ اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔ معلوم ہوتا تھا کمرہ۔ میز کرسیاں سب چکر کھا رہی ہیں۔ اس کا سر ایک بازو پر جھک گیا اور وہ بے سُدھ ہو کر اسی کرسی پر تمام شب پڑا رہا۔

علی الصباح قلعے کے باہر چند سپاہیوں کے ادھر اُدھر گھومنے کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ کبھی کبھی چاند کی ہلکی ہلکی روشنی میں آہنی سنگینوں اور تلواروں کی چمک بھی دکھائی دے جاتی تھی۔ ٹھیک اسی وقت اس تاریخی قلعے کی دو کھڑکیاں کھلی ہوئی تھیں اور ان میں سے پھوٹ پھوٹ کر روشنی باہر نکل رہی تھی ـــ یک بہ یک ایک گرج سنائی دی۔ "آگے بڑھو" قلعہ پر حملہ کرو" ـــــــ"

آواز کے ساتھ ہی ہزاروں بندوقیں اٹھیں اور ایک ساتھ قلعے پر باڑھ پڑی۔ قلعے کی کھڑکیاں اور بڑا دروازہ ٹوٹ کر نیچے آرہا۔ اور فوراً تمام دستہ قلعے میں داخل ہو گیا۔ پچاس منتخب اور تجربہ کار دلاوروں نے ادھر اُدھر تلاش کرنے کے بعد باورچی خانے کا رخ کیا۔ غریب والٹر اب تک میز پر پیر پھیلائے۔ اطمینان سے سو رہا تھا۔ یکدم ان پچاس بہادروں نے بندوقیں اٹھائیں اور اس کے سینے کا نشان باندھ دیا۔ "ہاتھ اوپر اٹھاؤ"۔ نیم خوابیدہ نیم مردہ جرمن نے کانپتے ہوئے ہاتھ اوپر اٹھاتے اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر انہیں دیکھنے لگا۔ چند جوانمرد آگے بڑھے اور اُسے گرفتار کر لیا۔

ایک نوجوان افسر نے آگے بڑھ کر اس سے کہا۔ "اب تم ہمارے قیدی ہو"۔ یہ سنتے ہی غریب جرمن کانپ اُٹھا مگر فوراً اُس کے چہرے پر مسرت کی ایک لہر دوڑ گئی۔ کیونکہ اس وقت اس کے دونوں خواب "روٹی" اور "قید" پورے ہو رہے تھے۔ اسی اثنا میں ایک معمر افسر آپہنچا جسے دیکھ کر سپاہیوں نے راستہ خالی کر دیا۔ نوجوان افسر نے چلا کر کہا۔ جناب ہم نے دشمنوں کو بھگا دیا۔ ایک بچ رہا

ہے سو وہ بھی ہمارا قیدی ہے"۔ معمر فرانسیسی نے جو لشبری سے سالارِ لشکر معلوم ہو رہا تھا اپنی پیشانی پر بل ڈال کر اور گرج کر کہا "فتح عظیم الشان فتح"۔ ساتھ ہی جیب سے ایک چرمی نوٹ بک نکال کر بہ عجلتِ تمام اس میں یہ عبارت درج کر ڈالی۔

" آج صبح ایک زبردست حملے کے بعد ہمارے بہادر سپاہیوں نے جرمن دستوں کو پسپائی پر مجبور کر دیا۔ ایک شدید مزاحمت کے بعد جرمن قلعے کو خالی چھوڑ کر اور اپنے زخمیوں اور مقتولین کو ہمراہ لے کر بھاگ گئے۔ اُن کے نقصان کا اندازہ سو سوا سو کے قریب ہے جن میں سے ایک معقول تعداد گرفتار بھی ہو گئی ہے۔ مگر صرف ایک ہی کے زندہ بچ رہنے کی اُمید ہے ہمارا بہت خفیف سا نقصان ہُوا۔

تاریخ ——— دستخط ———

اس کے بعد اُس نے اپنے ماتحت افسروں کو حکم دیا۔" اب ہیڈ کوارٹر واپسی ہو گی۔ نصف بندوقچی ہراول اور نصف عقب میں اتفاقی حملے کے لئے ہمہ وقت تیار۔ باقی ماندہ فوج قیدی کے ہمراہ۔ اچھا صف بندی "۔

فرانسیسی دستے فتح و کامرانی کے نشے میں بڑی آن بان کے ساتھ واپس ہوئے۔ والٹر سلاح بند سپاہیوں کے حلقے میں لے لیا گیا۔ اور اس طرح تمام فوج روانہ ہوئی۔ راستے میں سورج نکل آیا۔ دیہاتیوں نے پا بجولاں جرمن کو دیکھ کر قومی نعرے بلند کئے۔ ایک کرنیل نے آگے بڑھ کر سپاہیوں کو قیدی سے ہوشیار رہنے کا حکم دیا اور اس طرح یہ ٹڈی دل ہیڈ کوارٹر پہنچ گیا۔ وہاں پہنچ کر والٹر سنگین پہرے میں رکھا گیا اور اس طرح شمپین گنٹ (Champen Gent) کا یہ تاریخی قلعہ جرمن حملہ آوروں سے چھ گھنٹے کی مدت میں واپس لے لیا گیا۔ اخباروں نے اس عظیم الشان فتح پر افتتاحی مقالے لکھے۔ قومی مجلس میں بہادر سپاہیوں کو خراجِ تحسین ادا کیا گیا۔ افسروں کو تمغے عنایت ہوئے اور سپہ سالار کو خطابات۔

غریب والٹر کو ابتداءً اس سوئے ہضمی کی شکایت ضرور ہو گئی تھی۔

(ماخوذ) عزیز الرحمٰن ہاشمی گورکھپوری

دلِ آشفتہ و دیدہ خونبار داری مگر با محبّت سروکار داری

کہ نشتر فرو بردِ در مغز جانت؟ کہ رگ ہائے مژگاں گہربار داری

گلِ نازپروردِ من بے قراری ہمانا کہ در پیرہن خار داری

وجدانیات

رباعی

گردابِ ملامت سے نکالا تو نے
ساقی کے قدم پر مجھے ڈالا تو نے
مستی میں بہکنے کا بہت امکاں تھا
اے لغزشِ پا خوب سنبھالا تو نے

تھوڑی سی خودی سے کرلے کام یہ دیوانہ
خود شمع پھرے آکر گردِ پرِ پروانہ
پھر شورِ انا الحق سے دنیا کو اُٹھا سر پر
رب ارنی کب تک اے ہمتِ مردانہ
تقدیر کھلی مرکر دی اُس نے جگہ در پر
سنگ سرِ تربت ہے سنگِ درِ جانانہ
کس رند کی حسرت نے مے جام سی چھلکا دی
کس دستِ حنائی میں تڑپا خطِ پیمانہ
بلبل! کہیں نالوں سے دل گُل کا پگھلتا ہے؟
اِس کے لئے لازم ہے سوزِ دلِ پروانہ
اے لختِ جگر میری پلکوں پہ ذرا تھم جا!
تو زینتِ مژگاں ہے اشکوں میں نہ بہ جانا
اے وجد خودی اپنی پامال نہ ہونے دے
سر کو نہ جھکا ہرگز کعبہ ہو کہ بُت خانہ

سکندر علی وجد

ماں

ماں اپنے بچے کے قریب بیٹھی ہے، وہ غمگین ہے اور اُداس کیونکہ بچہ بیمار ہے۔ بالکل زرد پڑ گیا ہے۔ آنکھیں بند ہو چکی ہیں۔ اور سانس بھی رُک رُک کر آ رہی ہے۔ بارہ رہ کر زور سے سانس لیتا ہے اور ماں اور اُداس ہو جاتی ہے۔ . . . اسی وقت کسی نے زنجیر کھٹکھٹائی اور ایک پیر مرد کمبل اوڑھے ہوئے اندر داخل ہوا۔ جاڑے کا موسم تھا۔ چاروں طرف برف گر رہی تھی اور ہوا تیز و تند تھی۔ چبھتی ہوئی! نووارد کانپ رہا تھا چونکہ بچے پر اس وقت غنودگی سی طاری ہو گئی تھی اس لئے ماں اُٹھی اور چولہے سے پیالے میں تھوڑی سی شراب لائی اور آگ پر گرم کرنے کے لئے رکھ دی نووارد بیٹھا پالنے کو جھلا رہا تھا۔ ماں اس کے قریب ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ اور متفکرانہ نگاہوں سے اپنے بچے کو دیکھنے لگی۔ سانس اب بھی رُک رُک کر آ رہی تھی۔

ماں (بچے کے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لے کر) "میں اسے جانے نہ دونگی۔ خدا ارحم الراحمین ہے وہ میرے بچے کو مجھ سے جدا نہ کرے گا"۔

اس پر نووارد نے عجیب انداز سے سر ہلایا جس سے نہ تو یہ پتا چلتا تھا کہ اس کا جواب نفی میں ہے اور نہ یہ کہ اثبات میں ہے! ماں نے آنکھیں نیچی کر لیں جن سے آنسوؤں کا دریا امنڈ پڑا۔ وہ سرگرانی محسوس کر رہی تھی۔ تین دن سے جاگ رہی تھی۔ اس لئے ذرا آنکھ لگ گئی لیکن فوراً ہی —— ایک منٹ کے بعد —— چونک پڑی۔ سردی سے کانپ رہی تھی۔ چاروں طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا پیر مرد جا چکا تھا اور لڑکا بھی! یقیناً پیر مرد اسے اپنے ساتھ لیتا گیا! سامنے دیوار پر ٹنگی ہوئی گھڑی بھی بند ہو چکی تھی۔ کمرے میں بالکل سکون تھا لیکن چین نہ تھا تو بیچاری غمزدہ ماں کے لئے! وہ اپنے لڑکے کی تلاش میں باہر دوڑ گئی۔ باہر ایک ضعیفہ سے جو ایک بڑے سیاہ لبادے میں لپٹی ہوئی تھی ملاقات ہوئی:-

ضعیفہ: "موت تمہارے گھر میں جا گزیں تھی! میں نے ابھی ابھی اس کو تمہارا لڑکا لئے جاتے دیکھا ہے وہ ہوا کے مانند چلتی ہے اور جس کو ایک دفعہ لے جاتی ہے پھر واپس نہیں دیتی"۔

ماں: "ہائے وہ کس راستے سے گئی؟! مجھے صرف راستہ بتا دو۔ میں پتا چلا لوں گی!"

ضعیفہ: "میں راستہ جانتی ہوں لیکن جب تک تم مجھے وہ سب گیت جو تم اپنے لڑکے کے پاس گایا کرتی تھیں نہ سناؤ گی نہ بتاؤنگی میں اُن کو پہلے بھی سُن چکی ہوں۔ مجھے بہت بھلے معلوم ہوتے ہیں۔ میں 'رات' ہوں۔ میں نے اکثر تمہارے رخساروں پر گانے کے وقت آنسو بہتے دیکھے ہیں!"

ماں: "میں سب سنا دونگی۔ مگر اس وقت نہ ٹھہراؤ۔ مجھے موت کو پکڑنے دو۔ کمبخت سے اپنا بچہ چھڑانا ہے!" لیکن رات خاموش رہی۔

وہ سنگدل بنی بیٹھی تھی! چار و ناچار ماں نے سب گیت سنائے۔ گیت بہت سے تھے لیکن قطراتِ اشک جو اس کی آنکھوں سے گرے اُن سے بھی زیادہ!!

رات: "اچھا تو تم داہنے ہاتھ صنوبر کے کنج سے ہوکر جاؤ۔ میں نے اُسے اسی طرف جاتے دیکھا ہے۔"

لیکن کنج میں کئی راستے ایک دوسرے کو قطع کرتے ہوئے گزر گئے تھے اور مصیبت زدہ ماں حیران تھی کہ کدھر جائے۔ وہیں ایک کانٹے دار جھاڑی تھی جس میں کوئی برگ و بار نہ تھا۔ سردی کا موسم تھا۔ کچھ برف کے ٹکڑے برہنہ شاخوں میں لپٹے ہوئے تھے۔

ماں: "کیا تم نے اس طرف موت کو میرا بچہ لے جاتے دیکھا ہے؟"

جھاڑی: "ہاں میں نے دیکھا ہے۔ لیکن جب تک تم مجھے اپنے گرم جسم سے ہم آغوش نہ کروگی میں نہ بتاؤں گی۔ سردی سے میرا بُرا حال ہے۔ تمام تخ ہو رہی ہوں۔"

ماں نے فوراً اسے اپنے سینہ سے چمٹا لیا۔ تمام کانٹے چبھ گئے اور خون کے بڑے بڑے قطرے جسم پر چھلک آئے لیکن موسم سرما کی اُس سرد رات میں بھی جھاڑی سرسبز ہوگئی۔ پھول لگنے لگے۔ پتیاں نکل آئیں ـــــ مصیبت زدہ ماں کے سینے میں اپنے لڑکے کے غم کی وجہ سے گرم آنسوؤں کا سمندر موجزن تھا۔

سامنے ہی ایک وسیع جھیل ملی جس میں نہ کوئی جہاز تھا نہ کشتی۔ نہ پانی ابھی پوری طرح منجمد ہوا تھا کہ وہ اُس پر سے گزر جائے اور نہ اتنا کم تھا کہ وہ پایاب اُتر جائے۔ پھر بھی موت سے اپنا بچہ واپس لینے کے لئے جھیل کو عبور کرنا ضروری تھا! اس نے پانی پیکر جھیل کو خشک کرنے کا ارادہ کیا۔ ایک تنہا انسان کی بساط سے یہ بات باہر تھی۔ پھر بھی شمعِ امید کی ایک ہلکی سی کرن اس کے سینے میں لرزاں تھی!... اسی فکر میں کنارے آئی:-

جھیل: "اس طرح تم کبھی کامیاب نہیں ہوسکتیں! البتہ ایک تجویز ہے۔ شاید تمہارے لئے مفید ہو۔ مجھے موتی جمع کرنے کا بہت شوق ہے! اور تمہاری آنکھوں سے زیادہ شفاف موتی میں نے آج تک نہیں دیکھا۔ اگر تم رو کر اپنی آنکھیں میرے پانی میں بہا دو تو میں تم کو "قصرِ اجل" تک پہنچا دوں۔ موت وہیں اپنے سب پھولوں کے پودوں کی جن میں سے ہر ایک درخت درحقیقت ایک انسانی روح ہے نگہداشت کرتی ہے۔"

ماں: "ہائے میں اپنے بچے کے لئے کیا کچھ قربان نہیں کرسکتی!"

یہ کہہ کر وہ یہاں تک روئی کہ اس کی آنکھیں جھیل کی تہ میں پہنچ گئیں اور دو بیش بہا موتی بن گئیں۔ مسرت کی موجیں جھیل کے سینے میں بڑے زور و شور سے اٹھیں اور اُس نے ماں کو اٹھا کر دوسرے کنارے پر پہنچا دیا ـــــ یہاں ایک عجیب سیاہ عمارت تھی جو میلوں تک چلی گئی تھی۔ کوئی نہ کہہ سکتا تھا کہ حقیقتہً کوئی عمارت ہے جسے انسانی ہاتھوں نے تعمیر کیا ہے یا کوئی پہاڑ جس میں لاتعداد غاریں اور

پُرخطر جنگل! لیکن غریب ماں جو پہلے ہی اپنی آنکھیں جھیل کی نذر کر آئی تھی اِن کو نہ دیکھ سکی :-

ماں :- "ہائے میں موت کو کدھر ڈھونڈوں کہ میں اس سے اپنا بچہ طلب کروں!"

اس وقت قصر اجل میں صرف ایک سفید بالوں والی ضعیفہ تھی جو موت کی غیر حاضری میں اس کے باغ کی نگہبانی کرتی تھی :-

ضعیفہ :- "وہ یہاں ابھی تک نہیں آئی ہے . . . لیکن تم یہاں تک کیونکر پہنچ سکیں؟ تمہیں راستہ کس نے بتایا؟"

ماں :- مجھے میرا خدا یہاں تک لایا ہے۔ وہ ارحم الراحمین ہے۔ خدا کے لئے تم بھی رحم کرو اور بتاؤ میرا لڑکا کہاں ہے؟"

ضعیفہ :- میں نہیں جانتی لیکن مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تمہاری آنکھیں جاتی رہی ہیں۔ آج کی رات تو بہت سے تازہ پھول اور درخت کملائے ہیں۔ وہ آتی ہی ہوگی اُسے اِن سب کو از سرِ نو دوسری جگہ بونا ہے۔ یہاں کا پتہ پتہ ایک فرد سے مخصوص ہے۔ ہر پھول پتی میں دل ہے ہر دل دھڑکتا ہے۔ زیادہ بے چین نہ ہو۔ بہت ممکن ہے کہ تم ان پھولوں میں کان لگا کر اپنا لڑکا پہچان لو لیکن اگر میں تم کو اس سے زیادہ مفید باتیں بتاؤں تو تم مجھے کیا دوگی؟"

ماں :- میرے پاس کچھ نہیں۔ ہاں میں تمہارے لئے ایک سرزمین سے دوسری سرزمین تک جا سکتی ہوں"

ضعیفہ :- "لیکن مجھے اس سے کیا فائدہ؟ ہاں مجھے تمہاری لمبی سیاہ زلفیں بہت پسند ہیں تم مجھے یہی دے دو اور ان کے عوض میرے سفید بال لے لو"

ماں :- "بس یہی؟ یہ میں تم کو بخوشی دیتی ہوں"۔

یہ کہہ کر اس نے اپنے سیاہ بال سفید کے عوض دے دیئے۔ اس کے بعد دونوں موت کے باغ میں آئیں۔ یہاں طرح طرح کے پھول پودے اُگے ہوئے تھے کہیں تو نرگس و لالہ کی بے شمار قطاریں تھیں اور کہیں رنگ برنگ کے آبی پودے جن میں بعض تو بالکل تر و تازہ تھے اور بعض بالکل زرد! طرح طرح کے آبی کیڑے اور زہریلے سانپ اُن کی جڑوں میں لپٹے ہوئے تھے! کہیں بڑے بڑے تاڑ اور بلوط کھڑے تھے تو کہیں کرفس کی بیلیں اور دوسرے خوشبودار ننھے ننھے پودے بھی لہک رہے تھے۔ ہر پھول ہر پودے کا ایک انسانی نام تھا اور ان میں ہر ایک کسی انسان کی زندگی سے متعلق تھا بعض بڑے پودوں کے چھوٹے گملوں میں ہونے سے ان کی جڑیں کمزور ہوگئی تھیں اور معلوم ہوتا تھا کہ گملے عنقریب پھٹ جائیں گے بعض چھوٹے پودے وسیع اور زرخیز جگہوں میں لہلہا رہے تھے۔ ان کی جڑوں میں کائی لگی ہوئی تھی لیکن ان کی کافی خبرگیری اور نگہداشت کی جاتی تھی۔ مصیبت زدہ ماں چھوٹے پودوں کے پاس آئی۔ ہر ایک میں اُسے انسانی دل کی دھڑکن سنائی دی۔ اپنے لڑکے کو وہ ہزاروں میں پہچان گئی :-

ماں :- "میرا لختِ جگر یہی ہے!"

اور اس نے ایک نیلے رنگ کے چھوٹے سے پھول کی طرف ہاتھ بڑھایا جو مرجھا کر ایک طرف لٹکا ہوا تھا!

ضعیفہ:- خبردار! ہاتھ سے نہ چھونا۔ تم یہیں کھڑی رہو! اور جب موت آئے — اور مجھے ہر لمحہ اس کے آنے کی امید ہے — تو اس کو یہ پھول توڑنے نہ دو بلکہ یہ کہہ کر دھمکاؤ کہ میں بہت سے دوسرے پھولوں کا بھی یہی حشر کر دوں گی۔ شاید اس سے وہ ڈر جائے۔ کیونکہ اسے خدا کے یہاں اس کا حساب دینا ہوگا۔ وہ کوئی پھول بلا اجازت نہیں توڑ سکتی!"

دفعتہً ایک نہایت سرد ہوا چلی جس سے اندھی ماں کو معلوم ہوگیا کہ موت آگئی۔

موت:- "تم کون؟ اور مجھ سے پہلے یہاں کیونکر آسکیں؟"

ماں:- "میں ایک ماں ہوں!"

موت نے اپنا لمبا ہاتھ اس نازک نیلے پھول کی طرف بڑھایا۔ مگر ماں اسے اپنے ہاتھوں سے بالکل ڈھکے ہوئے تھی۔ اس پر موت نے ایک پھونک ماری جو اس قدر سرد تھی کہ ماں نے فوراً اپنے ہاتھ ہٹا لئے:-

موت:- "تم مجھ پر غالب نہیں آسکتیں"۔

ماں:- "میرا خدا تو آسکتا ہے۔ وہ ارحم الراحمین ہے!"

موت:- "تو میں بھی تو جو کچھ کرتی ہوں اسی کی مرضی سے کرتی ہوں۔ میں اس کی باغبان ہوں۔ اُس کے پھولوں اور پودوں کو یہاں سے لے جا کر باغِ جناں میں جس سے تم واقف نہیں بو آتی ہوں۔ رہا یہ امر کہ وہ باغ کہاں ہے تو میں تمہیں یہ نہیں بتاتی۔"

ماں:- (بصد منت و زاری) "مجھے میرا لڑکا دے دو"۔

یہ کہہ کر اُس نے جھٹ سے دو خوبصورت پھول مضبوط تھام لئے! اور بولی "میں تمہارے سب پھولوں کو توڑ ڈالوں گی میں بے چین ہو رہی ہوں!"

موت:- "خبردار! ہاتھ سے نہ چھونا۔ تم تو بے چین ہو ہی رہی ہو اور ماؤں کو بھی ہلکان کرنا چاہتی ہو؟!"

ماں:- (پھولوں کو ہاتھ سے چھوڑ کر) "اور ماؤں کو؟"

موت:- "لو اپنی آنکھیں لو میں انہیں جھیل سے لیتی آئی ہوں۔ یہ جھیل میں چمک رہی تھیں لیکن مجھے یہ معلوم نہ تھا کہ یہ تمہاری ہیں اب یہ پہلے سے بھی زیادہ شفاف ہیں۔ ان سے اس گہرے کنوئیں میں دیکھو۔ یہاں کا ہر پھول ذی روح ہے۔ جن پھولوں کو تم ابھی ابھی توڑنا چاہتی تھیں ان کا نام تمہیں نہ بتاؤں گی لیکن اُن کی انسانی زندگی کا پورا مستقبل تمہیں اس میں منعکس نظر آئیگا اور جنہیں تم ہلاک کر رہی تھیں ان کے حالات بھی اس میں دیکھو"۔

ماں نے دیکھا تو حقیقتہً ایک عجیب نظارہ تھا! ایک تو بڑا خوش نصیب تھا۔ طرح طرح کی نعمتیں اس کی قسمت میں تھیں اور اس کے کارناموں سے دنیا گونجنے والی تھی لیکن دوسرے کی زندگی سرتاپا مصائب و آلام سے پُر تھی اُس کی قسمت میں بجز افلاس کے کچھ نہ تھا۔

موت:۔ "دونوں خدا ہی کے بندے ہیں مگر ایک دوسرے میں زمین آسمان کا فرق ہے!"

ماں:۔ (پھولوں کی طرف اشارہ کر کے) "ان دونوں میں بدبخت کون ہے اور خوش نصیب کون؟"

موت:۔ "میں نہیں بتا سکتی۔ ہاں ان میں سے ایک تمہارے لڑکے کی حالت کو ظاہر کرتا ہے۔ تم نے اپنی لڑکے کے مستقبل کو دیکھ لیا!"

یہ سن کر ماں خوف سے چیخ اٹھی:۔

"خدا کے لئے بتاؤ میرا بچہ کون ہے؟ معصوم بچے کو بچاؤ۔ اس کو اس کے مصائب سے چھڑاؤ۔ لے جاؤ۔ اسے خدا کے اس باغ میں لے جاؤ جہاں کسی زندہ انسان کے ناپاک قدم نہیں پہنچ سکتے۔ اے موت! بھول جا میری منتوں کو۔ میرے آنسوؤں کو۔ اور جو کچھ میں نے کیا ہے اس کو بھول جا!"

موت:۔ "میں نہیں سمجھی تمہارا کیا مطلب ہے۔ اپنا لڑکا واپس لوگی یا میں اسے لے جاؤں؟"

ماں فوراً سجدے میں گر پڑی اور خدائے بزرگ و برتر سے ملتجی ہوئی "اے میرے معبود۔ میری نہ سن۔ میری دعاؤں کو نہ قبول کر۔ جو تیری مرضی ہے عین صواب ہے۔ تو دانا و بینا ہے۔ ارحم الراحمین ہے۔ تیری مصلحت کو کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ میری نہ سن۔ اے میرے مالک میری نہ سن . . . ."

اور ماں اب مطمئن تھی۔ اس کا سر اس کے سینہ پر گر پڑا اور اسے سکون حاصل تھا! اور موت اس کے بچے کو لے گئی وہاں! جہاں کی خبر آج تک کسی کو معلوم نہیں ہوئی۔ وہ جگہ جو ابد تک انسان کے لئے نامعلوم ہی رہے گی!! . . . .

(ترجمہ) زبیر احمد

غزل

کوئی پیغام نہیں آتا — کوئی آتا، نظر نہیں آتا
دل جو اک بار عشق سے بھٹکا — پھر کبھی راہ پر نہیں آتا
جب سے اُن کا نقاب اُٹھا ہے — لطفِ ذوقِ نظر نہیں آتا
لوگ محفل میں آئے بیٹھے ہیں — میرِ محفل نظر نہیں آتا
دل میں بیٹھا ہے درد کی صورت — جو کسی کو نظر نہیں آتا

لاکھ کوشش ظفر نے کی ہمدم
دل کسی پر، مگر نہیں آتا

ظفر ہاشمی

دوشیزہ اور مرغِ بادنما

"اے چمکتے پروں والے سنہری پرند! اے مرغِ بادنما!!
گرجے کے کلس کے اوپر گاؤں کے مینار کی چوٹی پر سے دیکھ کر بتا تجھے کیا کیا دکھائی دے رہا ہے؟"

"مجھے مینار پر سے مکانوں کی چھتیں اور گاؤں کے بازار نظر آ رہے ہیں۔
جن میں لوگ ادھر اُدھر پھرتے دکھائی دے رہے ہیں۔
اور دُور بہت دُور بغیر کسی چھت اور بازار کے نمکین پانی کا وسیع سمندر پھیلا ہے۔
جس میں مچھیروں کی چھوٹی چھوٹی کشتیاں نظر آ رہی ہیں۔

اور جہاں زمین ختم ہو جاتی ہے ـــ لائن کی بندرگاہ سے بھی بہت پرے ـــ ایک جہاز سمندر سے خشکی کی طرف آ رہا ہے۔
عرشۂ جہاز پر ایک نوجوان گلے کے گرد ایک ریشمیں رومال لپیٹے کھڑا ہے۔
اب وہ اس رومال کو ہونٹوں سے لگا کر بھینچ رہا ہے۔
اب وہ اپنی انگلیوں کے سرے چوم رہا ہے۔
اب وہ دور سے رومال ہلا رہا ہے۔
اور دور ہی سے بیتاب عاشق کے بوسے ساحل کو آ رہے ہیں۔

"آہ یہی ہے میرے محبوب کا جہاز جس میں وہ باوفا اس قدر بےتاب واپس آ رہا ہے۔
اے مرغِ بادنما وہ تیری طرح نہیں کہ ہوا کے رُخ کے ساتھ ہی بدل جائے۔ اس کی محبت غیر فانی ہے"۔

"اے مخمور نگاہوں والی دوشیزہ! اے سنہری بالوں والی خوبصورت پری! افسوس تھوڑی ہی دیر میں جب تیرا محبوب تجھ سے ہمکنار ہوگا اور میرا رُخ دوسری طرف پھر جائیگا تو اس وقت دل ہی دل میں خود تو بھی میری ممنون ہوگی۔

مہدی علی خاں

(ترجمہ)

نبی اور رسول

"اصلاحِ ادب" کے عنوان سے مولانا نشتر جالندھری کی طرف سے ایک نہایت مفید مضمون ہمایوں میں بالاقساط شائع ہوا ہے جس میں وہ ادبی اغلاط کی اصلاح کر کے ساتھ ہی دلائل بھی پیش کر رہے ہیں۔ اسی مضمون میں ایک مقام پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ذکر کرتے ہوئے آپ فرماتے ہیں کہ اس نام کے ساتھ رسول کی جگہ نبی کا لفظ استعمال کرنا چاہیئے کیونکہ رسول ایسے پیغمبر کو کہتے ہیں جو صاحبِ کتاب ہو۔ گویا اس کا یہ مطلب ہے کہ حضرت ابراہیم صاحبِ کتاب پیغمبر نہیں ہیں۔ نیز وہ پیغمبر جو صاحبِ کتاب نہیں اس پر رسول کی جگہ نبی کا لفظ اطلاق پاتا ہے۔

اس اختلاف کا فیصلہ کرنے کے لئے قرآنِ کریم سے بڑھ کر کوئی حَکَم نہیں۔ جب ہم قرآن کریم پڑھتے ہیں تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام صاحبِ کتاب پیغمبر ہیں اور اُن کی کتاب کا ذکر سورۂ اعلیٰ کی آخری آیات میں بایں الفاظ کیا گیا ہے:۔ اِنَّ هٰذَا لَفِي الصُّحُفِ الْاُوْلٰى صُحُفِ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى۔ (یقیناً یہ پہلے صحیفوں میں ہے ابراہیم کے صحیفوں میں اور موسیٰ کے صحیفوں میں) اس سے صریح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام بھی اسی طرح کے صاحبِ کتاب رسول ہیں جس طرح کے حضرت موسیٰ علیہ السلام بلکہ بعض محققین نے تو یہاں تک ثابت کیا ہے کہ وید جنہیں ہندو برہما پر نازل شدہ مانتے ہیں وہ درحقیقت صحفِ ابراہیم ہی میں سے ایک صحیفہ تھا جس کا نام الوواد تھا اور جو مرورِ زمانہ کے تغیرات سے وید بن گیا۔ اور برہما دراصل حضرت ابراہیم ہی کا بگڑا ہوا نام ہے چنانچہ مولوی نعمت اللہ خان صاحب گوہر بی اے اپنی کتاب تحفۂ ہند و یورپ کے صفحہ ۳ پر فرماتے ہیں:۔ "وید دراصل الوواد ہے جو صحفِ ابراہیمی میں سے ایک گرامی صحیفہ تھا۔ اس کی تدوینِ اوّل ۶۰۰ ق م میں بیاس جی کے ہاتھوں ہوئی۔ اسے چار حصوں میں تقسیم کیا گیا۔ بدھ مت کے دور میں ان پر سخت آفت آئی اور قریب قریب دنیا سے مفقود ہو گئے ۔ ۔ ۔ موجودہ وید کو وسکر نامی ایک کشمیری پنڈت نے مرتب کیا جس نے بقول البیرونی غزنویوں کے زمانے میں سہل ترین پہلوی جس کو آریہ غلطی سے سنسکرت سمجھے بیٹھے ہیں میں مرتب کیا۔" زیادہ تفصیل اور ثبوت دیکھنے کے لئے خان صاحب موصوف کی کتاب ملاحظہ فرمائی جائے۔

اب حضرت ابراہیم علیہ السلام کے صاحبِ کتاب ثابت ہو جانے کے بعد مولانا نشتر صاحب کے مقررہ معیار کے مطابق بھی حضرت ابراہیم کے نام کے ساتھ رسول کا لفظ استعمال کیا جا سکتا ہے لیکن مولانا موصوف کا معیار بھی قرآن کریم کی رو سے کوئی صحیح معیار معلوم نہیں ہوتا کیونکہ قرآن کریم میں ایسے انبیا کے اسمائے گرامی کے ساتھ بھی رسول کا لفظ آیا ہے جنہیں عموماً مسلمان صاحبِ کتاب تسلیم نہیں کرتے۔ عام طور پر چار ہی کتابیں مشہور ہیں یعنی زبور۔ تورات۔ انجیل اور قرآن لیکن انبیا ایک لاکھ سے بھی زیادہ بیان کئے جاتے ہیں جن میں سے وہ لوگ جو حضرت موسیٰ کے بعد بنی اسرائیل میں مبعوث ہوئے۔ وہ تمام کے تمام تورات ہی پر عمل کرتے رہے۔ اُن کی طرف کوئی علیحدہ کتاب نازل نہیں کی گئی جیسا کہ سورۂ بقرہ کی آیت ۸۸ میں آتا ہے:۔ وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَقَفَّيْنَا مِنْۢ بَعْدِهٖ بِالرُّسُلِ (اور ضرور ہم نے موسیٰ کو وہ کتاب دی اور اس کے بعد ہم پے در پے رسول لائے) اس آیت میں حضرت موسیٰ کے بعد پے در پے آنے والوں کو رسول کہا گیا ہے حالانکہ وہ کوئی جدید کتاب لانے والے نہ تھے۔ اسی طرح سورۂ طٰہٰ میں خداوند تعالیٰ حضرت موسیٰ اور ہارون سے کہتا ہے کہ فرعون کے پاس جاؤ اور اس سے کہو کہ ہم رسول ہیں۔ فقولا انا رسولا (سورۂ طٰہٰ آیت ۴۷) یہاں حضرت ہارون کو بھی رسول ہی کہا گیا ہے۔
اسی طرح سورۂ شعرا کو ملاحظہ فرمائیے اس میں حضرت نوح حضرت ہود حضرت صالح حضرت لوط حضرت شعیب علیہم السلام کا ان کی اپنی زبان سے رسول کے نام سے ذکر کیا گیا ہے۔ اب قرآن کریم کی اس قدر صراحت کے باوجود یہ کہنا کہ رسول کا اطلاق اسی پیغمبر پر ہوتا ہے جو صاحبِ کتاب ہو انصاف سے بعید ہے۔

میر اللہ بخش تسنیم

محفلِ ادب

حضرت آدمؑ وحواؑ کا قصہ اور آثارِ قدیمہ

حضرت آدمؑ وحواؑ کا قصہ کتبِ مقدسہ تورات و انجیل وغیرہ میں مذکور ہے' اور نصرانی علما کا اس خیال پر اتفاق ہے کہ سفرِ تکوین جس میں یہ قصہ بیان کیا گیا ہے حضرت موسیٰ کلیم اللہ علیہ السلام نے تقریباً ۷۰۰ قبل مسیح میں تحریر فرمایا تھا۔ حال ہی میں کچھ آثار تقریباً دو ہزار سال پہلے کے بعض ماہرانِ آثارِ قدیمہ کو ایسے دستیاب ہوئے ہیں جن پر حضرت آدمؑ وحوا کا قصہ منقوش ہے۔

یہ قصہ حقیقی ہو یا مجازی' اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ اس کی اشاعت قدیم ترین زمانہ سے ہوتی چلی آئی ہے۔ اخلاف اپنے اسلاف سے اس روایت کو بہ تواتر نقل کرتے رہے ہیں۔ یہ قصہ تورات میں جس نہج سے مسطور ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو مٹی سے پیدا کر کے ان کی خاک میں روح پھونکی۔ پھر ان کی رفاقت کے لئے حضرت حوا کو پیدا کیا جس کی شکل یہ ہوئی کہ حضرتِ آدم پر نیند طاری فرمائی۔ جب وہ سو کر اُٹھے تو اپنی ایک جانب حوا کو پایا۔ حضرتِ آدم اُن کے ساتھ جنت میں عیش و آرام سے بسر کرتے رہے۔ جنت میں جتنے پھول پھل اور میوے وغیرہ تھے ان میں سے کوئی چیز اُن کے لئے ممنوع نہ تھی۔ البتہ ایک درخت کو چھونے اور اس کے پھل کھانے کی سخت ممانعت تھی جو خیر و شر کی معرفت کا درخت تھا اس ممانعت نے دونوں کے دل میں اس کے پھل کھانے کی حرص پیدا کر دی۔ اس سے شیطان نے فائدہ اٹھایا اور سانپ کی صورت بن کر حضرت حوا کے پاس پہنچا اور انہیں شجرِ ممنوعہ کے پھل کھانے کی ترغیب دی۔ حضرت حوا اس کے بہکانے میں آگئیں۔ اس کے پھل خود بھی کھائے اور حضرت آدم کو بھی لالچ دلا کر کھلائے۔ اس نافرمانی سے دونوں پر خدا کا غضب نازل ہوا۔ یہ جنت سے نکال دیئے گئے اور زمین بھی اُن کی وجہ سے لعنت میں مبتلا ہو گئی۔

جزئیات کو چھوڑ کر نفسِ روایت قرآنِ کریم میں بھی تقریباً اسی طرح مذکور ہے اور دوسری اقوام قدیمہ کے یہاں بھی کم و بیش اسی قسم کی تفصیل پائی جاتی ہے۔ بہرحال قصہ کا خلاصہ جز زیادہ سے زیادہ ہو سکتا ہی اتنا ہی ہے جو اوپر بیان ہوا۔ اب مضمون کے دوسرے اجزا سے بحث کی جاتی ہے۔

علمائے آثار کا اتفاق ہے کہ انسانِ اول کا ظہور ان شہور شہروں میں ہوا جو دو دریاؤں کے مابین واقع تھے اور روایاتِ توریت کے تمام قرینے اس پر دلالت کرتے ہیں کہ باغِ عدن خواہ اس سے مکان حقیقی مراد ہو یا مکان مجازی ایسی ہی جگہ تھا۔ اس مقام کی آب و ہوا وہاں کے چشمے اور کنوئیں اور پھل پھول وغیرہ سب چیزیں انسانی رغبت کے لحاظ سے بہترین تھیں۔

حفریات کی تازہ خبروں سے معلوم ہوتا ہے کہ علمائے آثار کو کچھ چیزیں ایسی دستیاب ہوئی ہیں جن سے قصۂ آدمؑ وحوا کی کامل تائید ہوتی ہے۔ یہ اشیا ایسے شہر کے کھنڈروں میں ملی ہیں جو بلاشبہ انسان کے آباد کئے ہوئے شہروں میں سب سے زیادہ قدیم ہے یعنی شہر "تیب جورا" جو چھ ہزار

سال پہلے تعمیر ہوا تھا۔

ان چیزوں میں ایک ٹھیکری کا ٹکڑا خصوصیت سے اہم اور قابل ذکر ہے اس ٹکڑے پر ایک مرد اور ایک عورت کی شکل کندہ ہے تصویر سے معلوم ہوتا ہے کہ رنج وملال نے دونوں کی کمر جھکا دی ہے اور حزن وملال کے آثار ان کے چہرے سے نمایاں ہیں۔ یہ دونوں جنت سے برہنہ نکلے ہیں۔ اُن کے پیچھے ایک سانپ کھڑا ہوا اُن کی نگرانی کر رہا ہے جو گویا اُن کی نحوست کی تصویر ہے جس کی بدولت یہ مصیبت میں مبتلا ہوئے ہیں۔

ان مرد اور عورت کا نام تو نہیں لکھا ہے لیکن تصویری قرائن دلالت کرتے ہیں کہ یہ دونوں سانپ کے جال میں پھنس گئے تھے جو اُن کے جنت سے نکالے جانے کا باعث ہوا۔ ورنہ اس سے پہلے عیش وراحت کی زندگی بسر کر رہے تھے۔

اس امر کی تحقیق سے پتہ چلا ہے کہ جس نقاش نے اس شکل کو کندہ کیا ہے وہ تقریباً تین ہزار سات سو قبل مسیح یعنی اب سے کوئی پانچ ہزار سات سو برس پہلے موجود تھا۔ یہ زمانہ حضرت موسےٰ علیہ السلام کے قصۂ تخلیق عالم اور قصۂ آدم وحوا کے لکھنے سے دو ہزار سال پہلے کا ہے ٹھیکری پر جو نقش بنا ہوا ہے وہ اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ یہ قصہ اس زمانہ میں بھی متداول تھا اور کچھ بعید نہیں ہے کہ یہ قصہ اپنی نوعیت کا پہلا قصہ ہو جسے انسان نے اپنے جد امجد کی سرگزشت کے طور پر نسلاً بعد نسل روایت کیا ہو اور اسے مختلف طریقوں سے محفوظ رکھنے کی سعی کی گئی ہو۔

شہر "تیب جورا" جس کا اوپر ذکر کیا گیا بلاد بین النہرین کے شمال مشرق میں واقع ہے جن لوگوں نے اس شہر کے کھنڈر دریافت کئے ہیں وہ ایک علمی مہم کے ممتاز ارکان ہیں۔ یہ مہم امریکہ کے کئی کالجوں اور یونیورسٹیوں کے اہتمام سے ڈاکٹر سپیزر مشہور ماہر آثار کی سرکردگی میں بھیجی گئی تھی۔

اس مہم کے کئی سال شہر "ادر" کی کھدائی میں صرف ہوئے۔ یہ وہی شہر تھا جس کے متعلق گمان ہے کہ حضرت ابراہیم خلیل اللہ کا مولد تھا۔ اور اب سے پہلے یہ بھی خیال کیا جاتا تھا کہ "ادر" ہی انسان کا بسایا ہوا قدیم ترین شہر ہے۔ جب یہ مہم شہر "ادر" سے فارغ ہوئی تو دوران تلاش میں اُسے شہر "تیب جورا" کے کھنڈروں کا پتہ ملا جن کی کھدائی سے واضح ہوا کہ یہ شہر تو کلدانیوں کے شہر سے بھی زیادہ پرانا ہے بلکہ علمائے آثار کے پوری تجسس اور غور کرلے کے بعد بعض چھوٹے قریوں غاروں کو مستثنےٰ کر کے انسان کا قدیم ترین شہر "تیب جورا" ہی کو قرار دیا۔ ظاہر ہے کہ ایسی قدامت معلوم ہونے کے بعد حضرت آدم وحوا علیہما السلام کے قصہ والی ٹھیکری ملنے پر کوئی تعجب کی گنجائش نہیں رہتی۔

جو لوگ نص تورات کی بنا پر اس عقیدہ کے قائل ہیں کہ باغِ عدن بین النہرین واقع تھا اُن کا عقیدہ توریت کی ان آیات سے ماخوذ ہے:۔

"مشرقی عدن میں ایک باغ لگایا اور اس میں آدم کو رکھا۔ عدن سے ایک دریا نکلتا ہے جو اس باغ کو سیراب کرتا تھا اور وہاں تقسیم ہو کر اس سے چار دریا بہنے لگے تھے۔ ایک دریائے فیشون جو سرزمین "حویلہ" کو محیط تھا جس میں سونا، گوگل اور حجر الجزع (رنگ) پیدا ہوتا تھا دوسرا دریائے جیحون جو سرزمین کوس کو احاطہ کئے ہوئے تھا تیسرا دریائے حدائل جو اشور کے جانب مشرق رواں ہے۔ چوتھا دریائے فرات (سفر تکوین الاصحاح ۲: ۸)"۔

بعض مفسرین تورات کا خیال ہے کہ فیشون بحر ہند کا نام ہے اور باغ عدن اس کے ساحل پر ہندوستان میں تھا بعض کی رائے میں

دریائے جیحوں، دریائے نیل ہے اور یہ جنت اس کے کنارے مصر میں بنی تھی۔ مگر جمہور مفسرین کو اس سے اختلاف ہے وہ بتاکید بیان کرتے ہیں کہ جنتِ عدن بین النہرین واقع تھی یعنی کسی ایک دریا یا سمندر کے ساحل پر نہ تھی اس کا محل وقوع دو کے درمیان تھا۔

جب ماہرینِ آثار نے ان دریاؤں کے مابین، کھنڈروں کی کھدائی شروع کی تو وہ اشور بابل اور بلاد کلدان کی تاریخ سے بہت کم واقف تھے۔ ان کی معلومات کا زیادہ حصہ تورات کے بیان تک محدود تھا۔ اس سے ان شہروں کے تمدن قایم ہونے اور اُن کے تباہ ہونے کا پتہ چلاتا تھا۔ مگر اُن کے آغاز و انجام کی شرح و کیفیت اور مدتِ مرور وغیرہ کی تاریخ سے بالکل ناواقف تھے، یہی صورت، کنعانیوں، فلسطینیوں اور عبرانیوں کے تمدن کی تھی، جن کا تعلق کچھ نہ کچھ مذکورہ تمدنوں سے رہا ہے۔ گزشتہ صدی کے نصف آخر میں علمانے وحشی اقوام کے آثار کھودنا شروع کئے اور اُن کی مدنیت کے اسرار معلوم کرنے کی سعی کی۔ اس میں انہیں قابل ذکر کامیابی ہوئی اور بکثرت آثار کا پتہ چلا۔ اُن کے مطالعہ سے عبرانی تمدن کا وحشی اقوام کے تمدن سے صحیح تعلق اور رشتہ معلوم ہوگیا خصوصًا اشوری اور بابلی تہذیب کا ربط اچھی طرح آشکارا ہوگیا۔ دوران تحقیق میں ان قوموں کی تاریخ اور روایات کی نسبت بہت سی چیزیں معلوم ہوئیں۔ جن میں ایک قصہ طوفان بھی ہے جو انہیں تمام و کمال بابلیوں کے قصص میں حاصل ہوا تھا۔ اس قصہ میں نوح علیہ السلام کے نام کی جگہ ایک اور نام "اوت نا پشتیم" درج تھا۔ ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہوا کہ اہل بابل ارواح، ملائکہ کروبیم، سرافیم وغیرہ کے وجود پر ایمان رکھتے تھے جو عبرانی مذہب کے مسلمات ہیں۔

علمائے آثار ان انکشافات کے بعد قصہ آدم و حوا علیہما السلام کے آثار پاکر چنداں حیران نہیں ہوئے۔ کیونکہ بابلی اور عبرانی تمدن کے درمیان مضبوط علاقہ ہونے کی قوی دلیلیں پہلے سے موجود تھیں، علاوہ ازیں یہ احتمال بھی ہوسکتا ہے کہ ان قومی و مذہبی قصوں کا مصدر جنہیں بابلی اور عبرانی نقل کرتے آئے ہیں اصل میں ایک ہو۔

چند سال ہوئے جب علمائے آثار کو ایسے آثار بھی دستیاب ہوئے تھے جن میں حضرت آدمؑ و حوا کی حکایت کے غیر صریح اشارے پائے جاتے تھے اور قرائن سے یہ ثابت ہوا تھا کہ حضرت آدمؑ و حوا اور اُن کے بھٹکنے کا قصہ اہل بابل کے یہاں بھی مشہور تھا۔ قرائن اور اشارات کی حیثیت و شان البتہ علما کے مابین وجہ اختلاف رہی ہے بعض کا خیال ہے کہ یہ قرائن اس قصہ پر صریحًا دلالت کرتے ہیں بعض ان میں غیر صریح سمجھتے ہیں۔ بہرحال نفس دلالت کے سب قائل ہیں۔

بابلی اور عبرانی روایات کے درمیان جو ربط معلوم ہوا ہے اس کے مبدء و منشا میں بھی اختلاف پایا جاتا ہے مشہور ہے کہ حضرت ابراہیم خلیل جن کے متعلق علمائے تورات کا بیان ہے کہ یہودیوں کی امت انہیں سے بنی۔ کلدانیوں کے شہر "اور" سے نکل آئے تھے۔ یہ شہر اُن کا مولد و مسقط الراس تھا، چونکہ اس کا نام ہی کلدانیوں کا "اور" ہے۔ جو خود اس پر دلالت کرتا ہے کہ حقیقت میں یہ شہر بابلی تھا اس سے ظاہر ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کے ساتھ بابل کی بہت سی روائتیں اور قصے بھی عبرانیوں میں منتقل ہوئے ہوں گے۔ پھر یہود مرور زمانہ "سے ارض موعود"

میں کنعانیوں سے جاملے ہوں گے۔

کنعانی اور فلسطینی لوگ اپنے نسب کو اہل بابل سے منسوب کرتے آئے ہیں اور اُن میں بابلیوں کے بہت سے قصے اور ان کے حالات جن میں مرور زمانہ سے تغیر و تحریف بھی ہوئی ہے رائج ہیں۔ غالباً جب عبرانی کنعانیوں اور فلسطینیوں میں شامل ہوئے ہونگے تو انہیں کنعانیوں میں بابلی عقائد و اخبار دیکھ کر کوئی تعجب نہ ہوا ہوگا۔

اس موقع پر قدرتاً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ خلقِ آدم و حوا اور اُن کے بھٹکنے کا قصہ اہل بابل کو کیونکر پہنچا کہ انہوں نے اس قصہ کو نقوش کی صورت میں مرتب کر دیا۔ سر دست اس کا جواب مشکل ہے۔ غالباً مستقبل خود جواب دے لے گا اس وقت تک جو کچھ ثابت ہے وہ یہ ہے کہ حضرت آدمؑ و حوا کی پیدائش اور ان کے غلطی میں مبتلا ہونے کا قصہ دنیائے بشریت کو کم از کم حضرت موسیٰ علیہ السلام سے دو ہزار سال پہلے بھی معلوم تھا۔ بلکہ غالباً اس سے بھی بہت پہلے بنی نوع انسان میں متداول تھا۔

بہت زیادہ تعجب کی بات یہ ہے کہ اہل بابل (۵۷۰۰) پانچہزار سات سو سال پہلے تمدن میں اس درجہ ترقی کر چکے تھے کہ اپنے قصص اور عقائد دینیہ کو ٹھیکروں پر نقش کر دیتے تھے جس ٹھیکرے پر حضرت آدمؑ و حوا کی تصویر کندہ ہے اس کو دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ نقش نہایت باریک اور نفیس ہیں۔ حضرت آدم کی ڈاڑھی نمایاں ہے جسم برہنہ ہے صرف سر پر ایک پوشش ہے۔ وہ جنت عدن سے نکل کر جا رہے ہیں۔ حضرت حوا بھی برہنہ ہیں اور آدم علیہ السلام کو پکڑے ہوئے ہیں۔ دونوں کے بشرہ سے ندامت و مسکنت کے آثار عیاں ہیں۔ غرض تصویر اپنے نقوش کے ذریعے سے تورات کی پوری روایت کا منظر سامنے کر دیتی ہے۔

ڈاکٹر سپیزر کو یہ تاریخی ٹھیکرا "تیپ جورا" کے کھنڈروں میں ملا تھا جن کے تفحص سے واضح ہوا ہے کہ اس مقام کے طبقات پر آٹھ شہر آباد ہو کر معدوم ہو چکے ہیں۔ ان کھنڈروں میں علمائے آثار کو لوہے یا تانبے کے آلات و ظروف کا کوئی پتہ نہیں ملا اس لئے شہر تیپ جورا بلا شبہ حجری زمانہ میں تعمیر ہوا ہوگا۔ ان سب باتوں سے مجموعی طور پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ تیپ جورا کے کھنڈر انسان کے دریافت کئے ہوئے کھنڈروں میں سب سے زیادہ قدیم ہیں۔

اس موقع پر یہ ذکر کر دینا بھی مناسب ہوگا کہ اس شہر کے کھنڈر ترقی یافتہ تمدن پر دلالت کرتے ہیں۔ ان کھنڈروں کے مزید حالات یہ ہیں۔

شہر کے وسط میں ایک وسیع میدان ہے جس میں ایک بڑا مندر بنا ہوا تھا۔ اس مندر کے پاس ایک مضبوط قلعہ تھا۔ آثار سے ظاہر ہے کہ شہر کا جنوبی حصہ تو نگروں کے سکونت کے لئے مخصوص تھا۔ شہر کے لئے باقاعدہ سڑکیں بنی ہوئی تھیں جن میں سے ایک شاہراہ عام بھی تھی۔

یہ بھی ظاہر ہے کہ شہر کی تعمیر کرنے والے دور رس نگاہ رکھتے تھے۔ مختلف اطوار اور تمدن کے متنوع طرز پسند کرتے تھے انہیں جنگ کے وقت حصار سے کام لینے کا اصول معلوم تھا اس لئے انہوں نے شہر کی فصیلوں کے اندر پانی کی خندق بنا رکھی تھی جس کی گہرائی ایک سو فٹ سے زیادہ تھی۔

شہر کے ہندسی آثار اس پر دلالت کرتے ہیں کہ اس قوم کا فن تعمیر نمایاں ترقی کر چکا تھا شہر کے مکانوں میں کوئی گھر کھڑکیوں، چھجوں اور مناروں وغیرہ سے خالی نہ تھا۔ یہ لوگ پل اور برجوں اور چوکیوں کی تعمیر کا راز جانتے تھے۔ یہ تمام معلومات اُن کے ذوق سلیم اور ذہنی مہارت کی شاہد ہیں:۔ سائنس

لکھنؤ اب سے پچاس سال قبل

حال یہ ہے کہ نو بجے تو خواب سے جاگے اور مجرد آنکھ کھلنے کے ارشاد ہوا کہ حقہ لاؤ خدمت گار جھٹ پٹ طیار کر کے لایا اُسے لیٹے لیٹے پیا کئے جب وہ جل کر خاک سیاہ ہو گیا تو جمائیاں لیتے ہوئے اُٹھے اور فرمایا میاں الٰہی بخش افیون جلد طیار کرو میں اس وقت بہت بے چین ہوں کل رات کو تو افیون نے ایسا کم نشہ کیا کہ رات بھر نیند نہیں آئی اور ہاتھ پیر ٹوٹا کئے ہر وقت یہی جی میں آتا تھا کہ تمہیں جگواؤں اور تھوڑی افیون پھر منگوا کر پیوں چونکہ رات زیادہ بڑھ گئی تھی لاچار اسی بے چینی کے عالم میں پڑا رہا انہوں نے جواب دیا حضور بیت الخلا تشریف لے جائیں افیون تیار ہے۔ اچھا لوٹا رکھواؤ۔ ہم بھی اُٹھتے ہیں۔ حقہ بھی بھر کر رکھوا دینا۔ دس بجے چوکی پر سے حقہ اور لوٹا ہاتھ میں لئے ہوئے برآمد ہوئے اور افیون نوش کی حکم ہوا کہ ہمارے بٹیروں کی کابک لاؤ اور شیر علی بٹیر باز کو بلاتے لانا۔ دیکھوں تو کہ انہوں نے رات کو پھٹک بھی دی یا نہیں ایسا نہ ہو کہ بھول گئے ہوں پھر پرسوں پالی میں ساری شیخی کر کری ہو۔ یہ کہہ کر بیٹھ گئے اور منہ دھونے کو پانی طلب کیا بعد فراغ پان نوش کیا۔ خدمتگار نے حقہ بھر کر رکھ دیا۔ اب بٹیروں کی طرف متوجہ ہوئے۔ دوست احباب جمع ہونے لگے چوسر یا گنجفہ ہونے لگا اتنے میں بارہ بجے آدمی نے دست بستہ ہو کر عرض کیا کہ حضور خاصہ طیار ہے۔ فرمایا بازی تمام ہو لے تو چلتے ہیں ایک بجے کے قریب اندر گئے اور کھانا نوش کیا تو اب گویا چوہے نے پارہ پیا۔ اب کب بیٹھا جاتا ہے پان کھاتے ہوئے خسخانہ پہنچے۔ پنکھا کھنچنے لگا۔ پھر آرام کیا۔ چار بجے اگر آنکھ کھل گئی اور کسی سے پوچھا کہ دن کتنا ہو گا۔ ذرا ٹٹی تو ہٹاؤ۔ ٹٹی ہٹانے کے ساتھ ہی دن تو دیکھا بھول گئے۔ بند کرو صاحب بند کرو۔ اُوہ کس قدر دھوپ ہے کہ منہ پھنکا جاتا ہے چلانے لگے اگر کسی نے کہا کہ اے حضور چار بج گئے اُٹھئے تو فرماتے ہیں کہ چاہے چار بجیں یا پانچ بجیں ہم تو جب تک یہ دھوپ کی گرمی ہے نہ اُٹھیں گے۔ خلاصہ یہ کہ دو گھڑی دن رہے جمائیاں لیتے ہوئے اُٹھے اور منہ دھو کر حقہ کی طرف متوجہ ہوئے کہ مرغ باز مرغ لے کر آیا۔ اور اس نے بیان کرنا شروع کیا کہ حضور کے نمک کی قسم رن سور ایسا لڑا کہ طرف ثانی کے مرغ کا بالکل خون خرابا ہو گیا اور تمام پالی بھر میں حضور کی دھوم ہو گئی اور دو دو بانی ان پٹھوں کے بھی ہو گئے شام تک اس مشغلہ میں مصروف رہے۔ آٹھ بجے اور چانڈو کی کشتی سامنے لا کر رکھی گئی۔ سب احباب جمع ہوئے اور شغل شروع ہوا۔ معاً شروع ہونے کے داستان گو نے بیچارے امیر حمزہ صاحبقران پر جھوٹ کے پل باندھنے شروع کئے۔ اور عمرو عیار کی جھوٹی عیاریاں اور دروغ بے فروغ بیان کرنا شروع کیا اور وہ جھوٹ کہ جس کا زمین و آسمان پر کہیں ٹھکانا نہیں۔ اگر کسی صاحب نے بعد کچھ دیر کے اُٹھنے کا قصد کیا تو صاحب خانہ نے اسی وقت اُن کا ہاتھ پکڑا اور کہاں میاں ابھی دس بھی نہیں بجے اور تم نے چلنا دھندا کیا۔ میرے سر کی قسم دو چار چھینٹے تو اور پیو۔ دیکھو تو آج مرزا نے کیا عمدہ قوام بنایا ہے جب بارہ بجے خدمتگار نے آکر کہا کہ رات دو پہر سے زیادہ آئی محل میں تشریف لے چلیئے۔ خاصہ ٹھنڈا ہوتا ہے ہنس کر کہنے لگے کہ آج تو کیا جلد بارہ بج گئے ہمیں تو ابھی نشہ بھی نہیں ہوا۔ خدا خدا کر کے کشتی سامنے سے اٹھی اور لڑکھڑاتے ہوئے محل میں داخل ہوئے۔ دسترخوان بچھا خاصہ نوش کیا۔ بعد فراغ ہاتھ منہ دھو کر پان کھاتے ہوئے پلنگ پر گئے۔"

"نگار بحوالہ ہندوستانی"

مشرقی و مغربی شعرا کا معشوق

جسٹس شاہ دین بالقابہ نے اپنے تعلیمی خطبہ میں "اردو شاعری" پر حسب ذیل گہرافشانی کی ہے :-

"انسانی تحریکات کا ایک شعبہ جس میں ہم مسلمان نقدانِ تربیتِ نفس کی وجہ سے نقصان اٹھا رہے ہیں، ہمارا علم ادب ہے۔ اور اس سلسلہ میں آپ کی توجہ اپنی عاشقانہ شاعری کے ایک شعبے کی طرف مبذول کرانی چاہتا ہوں۔ پرانی طرز کے مسلمان اردو شاعر کا معشوقِ خیالی جو انسانی حسن کا اعلیٰ معیار سمجھا تا ہے ایک فوق العادت کرشمۂ قدرت ہے جس کا دہن ھندسی کے نقطہ سے بھی چھوٹا اور جس کی کمر بال سے بھی زیادہ باریک ہے۔ نقطہ کے ساتھ دہن کی تشبیہ کی مثال کے لئے تو میں اس فارسی شاعر کا ایک شعر پیش کرتا ہوں۔ جس کے طرزِ بیان اور مذاق کی تقلید کی کوشش ہمارے اردو شعرا نے کی ہے :-

اے ناقصِ کلامِ حکیماں بیانِ تو ۔۔۔ کردی بہ نطق نقطۂ موہوم را دو نیم!

اور کمر کی تشبیہ کی مثال میں میں ایک اردو شاعر کے ایک مشہور شعر کا حوالہ دیتا ہوں ؎

صنم! کہتے ہیں تیرے بھی کمر ہے ۔۔۔ کہاں ہے کس طرف ہے اور کدھر ہے

اگر آپ حضرات ایک لمحہ کے لئے غور کریں تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ ظرف ادب میں اس قسم کی شاعری جو شاعر کے انتہائی مبالغہ کے شوق کو ظاہر کرتی ہے، قوتِ شاعری میں تربیتِ ضبط کے نقدان پر دال ہے اور جب آپ بھی یہ خیال فرمائیں گے کہ علم بلاغت کے جیّد مصنفین صنعتِ مبالغہ کو ان استعارات میں بلند مرتبہ دیتے ہیں جن سے ہماری شاعری میں خوبی اور قوت پیدا ہوتی ہے تو آپ کو تسلیم کرنا پڑیگا کہ ضبط و تربیت کا فقدان نہ صرف ہماری روزمرّہ کی زندگی میں پایا جاتا ہے بلکہ تخیّل کے ان قدرتی سرچشموں میں بھی پایا جاتا ہے۔ جو ہماری ذہنی ترقی کا بہت بڑا ذریعہ ہیں۔"

اس پر لسان العصر حضرتِ اکبر نے یہ دلچسپ منظوم لطیفہ خاص نقاد میں درج ہونے کے لئے مرحمت فرمایا جس کی شوخی و ستم ظریفی ناظرین نقاد سے خراجِ تحسین و آفریں وصول کئے بغیر نہ رہے گی۔ ملاحظہ ہو۔ فرماتے ہیں :-

کمر پتلی سنا کرتے تھے آگے ۔۔۔ مگر اب اس کو سب کہتے ہیں معدوم
ٹٹولا اس قدر ان شاعروں نے ۔۔۔ مچائی اس قدر گردِ کمر دھوم
جو کچھ تھی بھی ندارد ہوگئی وہ ۔۔۔ بہ ظاہر تو یہی ہوتا ہے معلوم
پھر ایسی عاشقانہ شاعری کیا ۔۔۔ یہی ہے وعظِ شاہ دین کا مفہوم

مشرقی شعرا کا معشوق تو آپ دیکھ چکے۔ اب اسی سلسلہ میں مغربی شعرا کا معشوق بھی ملاحظہ ہو جس کی تصویر مولانا عبدالحلیم صاحب شرر دلگداز میں یوں کھینچتے ہیں :-

۱۸۹۲ء میں لندن میں "پک میگزین" ایک ماہوار رسالہ نکلا کرتا تھا جس میں صرف تصویریں ہی ہوا کرتی تھیں۔ اس کے بہت سے نمبر میرے پاس بھی موجود ہیں۔ اس کے کسی نمبر میں وہاں کے شعرا کے معشوق کے خیالی حلیہ کی ایک تصویر بنا کے دکھائی گئی تھی اس کی گردن تو ہنس کی پتلی خمدار گردن تھی۔ ہونٹوں کی جگہ پر مونگے کے ٹکڑے تھے اور ان کے درمیان موتیوں کی دو لڑیاں تھیں۔ گالوں کی جگہ گلاب کے پھول تھے اور کانوں کی جگہ سمندر کے دو مدوّر لہردار شل (سیپ اور شاخ مرجان کی قسم سے سفید سفید مختلف الوضع چیزیں جو سمندر سے نکلتی ہیں) لگے ہوئے تھے اور بالوں کی جگہ سر پہ ہزار ہا قفل جڑ رہے تھے (انگریزی میں بالوں کے گھونگھروں کو "لاک" کے لفظ سے تعبیر کیا کرتے ہیں جس کے اصل معنی قفل کے ہیں)۔

اب دونوں معشوقوں کے دیکھنے کے بعد یہ فیصلہ کرنا نکتہ سنج ناظرین نقاد کا کام ہے۔ کہ مشرقی معشوق اچھا ہے یا مغربی؟ ہمارے خیال میں کسی زبان کی شاعری ان شاعرانہ نازک خیالیوں اور خیالی نقطہ آفرینیوں سے خالی نہیں لیکن خشک دماغ والے ان نازک مسائل کے جذب کرنے کی قابلیت نہیں رکھتے۔

دلبستان بحوالۂ نقاد جنوری ۱۹۱۴ء

محبّت

مترجمہ مرحوم آنریبل سر میاں محمد شفیع بیرسٹرایٹ لاء لاہور

بتائے کوئی عشق کیا چیز ہے؟ — زبانیں ہیں جس کے بیاں پر فدا
یہ کیسی تڑپ ہے کہ جس کے بغیر — نہیں چین انساں کو آتا ذرا

یہ ہے کیوں مثالِ ہوا بے قرار — شناسا تغیّر سے ہے کیوں مدام
یہ موجِ خوشی ہے کہ طوفانِ غم؟ — دیا ہے یہ دونوں کے ملنے کا نام

محبت ہے آقا محبّت غلام! — یہ ہے مہرباں بھی دلآزار بھی
اگر ہو تو رہتا ہے دل بیقرار — نہ ہو تو نہیں دل کو راحت کوئی

ہے ممکن کریں اس سے ہم اجتناب — یقیناً مجھے اس میں شک ہی کمال
خوشی ہے یہی اس کے صدمے سہوں — بغیر اس کے ہے زندگانی محال

دلبستان بحوالۂ مخزن ۱۹۰۴ء

مطبوعات

اقبال اس کی شاعری اور اس کا پیغام۔ مصنفہ شیخ اکبر علی صاحب بی اے ایل ایل بی یہ کتاب انگریزی زبان میں لکھی گئی ہے۔ کتاب کا موضوع جو اس کے نام سے ظاہر ہے موجودہ ادبیات میں بہت اہم ہے ہمیں مسرت ہے کہ شیخ صاحب نے نہایت قابلیت کے ساتھ اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اقبال اور اس کو سمجھنے کے لئے یہ کتاب ایک نعمت غیر مترقبہ ہے۔ اقبال کے متعلق اس قسم کی تصنیفات اس بات کا ثبوت ہیں کہ ہمارا ملک ابھی زندہ ہے اور جوہر شناس نگاہوں سے محروم نہیں ہوا۔ کتاب کا حجم ..۴ صفحات ہے قیمت مجلّد چار روپے۔ پتا:- شیخ اکبر علی صاحب ایڈوکیٹ ہسپتال روڈ لاہور

غالب کے دس جواہر۔ یہ ایک خوبصورت چھوٹی سی انگریزی کتاب ہے، جو ہمارے نوجوان ادیب و مصوّر دوست مسٹر شہاب الدین رحمت اللہ کے حسن مذاق کی آئینہ دار ہے۔ غالب کے دس اشعار مع انگریزی ترجمے اور تصاویر کے دبیز آرٹ پیپر پر حسن اہتمام سے شائع کئے گئے ہیں۔ انگریزی ترجمہ بھی نظم میں ہے اور قابل تعریف ہے مسٹر شہاب الدین رحمت اللہ کی کھینچی ہوئی کئی تصاویر ہمایوں میں اس سے قبل شائع ہو چکی ہیں اور ناظرین "ہمایوں" ان کی مصوّرانہ قابلیت سے واقف ہیں۔ یہ کتاب ہر لائبریری میں رکھنے کے قابل ہے۔ ہر شعر کی تصویر خوبصورت اور موزوں ہے۔ قیمت ایک روپیہ پتا:- مسٹر شہاب الدین رحمت اللہ صاحب۔ یوسف بلڈنگ۔ فریزر روڈ۔ پٹنہ

نخلستان۔ یہ ایک ماہوار ادبی و اصلاحی رسالہ ہے جو کچھ عرصہ ہوا ملتان سے جاری ہوا تھا ستمبر ۱۹۳۳ء سے اس کی نگرانی کا کام ہمارے قابل دوست ن۔ م۔ راشد صاحب ایم۔ اے نے اپنے ذمے لے لیا ہے۔ ناظرین ہمایوں "حضرت" راشد کے اشعار سے بارہا لطف اندوز ہو چکے ہیں ان کی نظمیں اردو شاعری میں ایک نئے دور کی نقیب ہیں۔ پیش نظر پرچے کو دیکھنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایک قابل ادیب کی نگرانی نے یک لخت نخلستان کا معیار کہاں سے کہاں پہنچا دیا ہے۔ چندہ سالانہ تین روپے اور ششماہی اڑھائی روپے سالانہ ہے۔ پتا:- مینجر "نخلستان" ملتان۔

تعلیم غذا اور تعلیم علاج:- یہ دو کتابیں کویراج ہر نام داس بی اے کی تصنیف ہیں کویراج صاحب کو فن طب میں بہت شہرت حاصل ہے زیر نظر دونوں کتابوں میں غذا اور علاج کے متعلق بہت سی ایسی ہدایات درج ہیں جن سے لوگ عموماً غافل ہوتے ہیں۔ یہ دونوں کتابیں ہر شخص کے زیر مطالعہ رہنی چاہئیں تعلیم علاج کا حجم سوا سو صفحات اور قیمت ۲ روپے تعلیم غذا کا حجم ۱۶۰ صفحات اور قیمت ۸ آنے ہے۔ پتا:- کویراج ہر نام داس بیرون لوہاری دروازہ لاہور

زندگی مصنفہ ملا رموزی۔ حجم ۳۱۲ صفحات قیمت دو روپے۔

ملا رموزی صاحب کے مزاحیہ طرز تحریر سے ملک روشناس ہے۔ بالخصوص ان کی گلابی اردو بہت مشہور ہو چکی ہے۔ اس کتاب میں ملا صاحب کے حسب ذیل مضامین ہیں (۱) اپنے علی گڑھ کالج کا مشاعرہ (۲) ساڑھے پانچ دن کا علی گڑھ (۳) علی گڑھ سے گھر تک (۴) ہندوستانی اولاد (۵) کھانسی (۶) طلبہ کا سفر (۷) سقے کے نیچے (۸) ذرا کان پور تک (۹) دست بدست (۱۰) عید کے بعد وغیرہ کل سترہ مضامین ہیں تفریحی تصانیف ادب میں ایک خاص درجہ رکھتی ہیں اور اس قسم کی اچھی کتابیں بلا شبہ قدر کے قابل ہوتی ہیں۔ پتا:- ملا رموزی توحیدی صاحب بھوپال۔



"اکسیر نسوان"

رحم کی تمام خرابیوں، ایام کے کل نقصوں کی
بےمثل دوا ہے۔ رحم کی کمزوری کے سبب جو
رطوبت خارج ہوتی ہے جسکو سیلان رحم کہتے ہیں
۔ اکسیر نسوان اسکا بےمثل علاج ہے۔
ہسٹریا (اختناق الرحم) کے دوروں میں اسکا
استعمال بےخطا ثابت ہوا ہے

IKSIR-I-NISWAN

A UTERINE TONIC.

تار کا پتہ
میڈیسنز
دہلی

The HINDUSTANI DAWAKHANA DELHI

بچوں کی طاقت بڑھانے والی مشہور دوائی

ڈونگرے کا بال امرت

یہ ڈونگرے کا بال امرت میٹھا ہونے کے سبب چھوٹے بچے بہت خوشی سے پیتے ہیں چھوٹے بچوں کی کھانسی - بخار - بدہضمی پیچش وغیرہ امراض جو اکثر ناطاقتی کی وجہ سے ہوتے ہیں - اس کے استعمال سے رفع ہو جاتے ہیں - اور اس سے بچوں کا بدن تھوڑے ہی عرصہ میں گوشت سے بھر کر جسم میں طاقت بڑھتی ہے



لاہور ایجنٹ



لالہ بھگت رام پوری اینڈ سنز سوتر منڈی لاہور

شمع شبستان

اردو شاعرات کا تذکرہ

میں نے اردو شاعرات کا تذکرہ مرتب کیا ہے جس کی ادب اردو میں بہت سخت ضرورت تھی چنانچہ چندہ اولین شاعرہ سے لیکر ۱۸۹۹ء تک کل شاعرات کا تذکرہ جمع کر لیا گیا ہے۔ اور کتابت ہو رہی ہے۔ اب میں ناظرات سے بصد ادب درخواست کرتا ہوں۔ کہ وہ دورِ حاضرہ کی شاعرات (۱۹۰۰ء سے ۱۹۳۱ء) کے حالات و نمونے شاعری سے مجھے سرفراز فرمائیں تا کہ یہ تذکرہ کسی حد تک مکمل ہو سکے کتاب کی اشاعت کی عجلت ہے۔ اسلئے ۲۵ دسمبر ۱۹۳۳ء تک مجھ کو شاعرات اپنے حالات اور اپنے نمونہ کلام سے مطلع فرمائینگی

قادری محمد بشیر احمد علوی ناظر بی اے (علیگ) میڈلسٹ

ایڈیٹر شمع شبستان

سید عبد اللطیف پرنٹر و پبلشر نے مرکنٹائل پریس چیمبرلین روڈ لاہور میں چھپوا کر دفتر رسالہ ہمایوں ۲۲-۳ لارنس روڈ لاہور سے شائع کیا

قواعد

۱- "ھمایوں" بالعموم ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو شائع ہوتا ہے ۔

۲- علمی و ادبی، تمدنی و اخلاقی مضامین بشرطیکہ وہ معیارِ ادب پر پُورے اُتریں درج کئے جاتے ہیں ۔

۳- دل آزار تنقیدیں اور دل شکن مذہبی مضامین درج نہیں ہوتے ۔

۴- ناپسندیدہ مضمون ۱؎ کا ٹکٹ آنے پر واپس بھیجا جا سکتا ہے ۔

۵- خلافِ تہذیب اشتہارات شائع نہیں کئے جاتے ۔

۶- ہمایوں کی ضخامت کم از کم بہتّر صفحے ماہوار اور سوا نو سو صفحے سالانہ ہوتی ہے ۔

۷- رسالہ نہ پہنچنے کی اطلاع دفتر میں ہر ماہ کی ۱۰ تاریخ کے بعد اور ۲۰ سے پہلے پہنچ جانی چاہیئے
اس کے بعد شکایت لکھنے والوں کو رسالہ قیمتہً بھیجا جائے گا ۔

۸- جواب طلب امور کے لئے ۱؎ کا ٹکٹ یا جوابی کارڈ آنا چاہیئے ۔

۹- قیمت سالانہ پانچ روپے چھ آنے ششماہی تین روپے (مع محصولڈاک) فی پرچہ ۸؍

۱۰- منی آرڈر کرتے وقت کوپن پر اپنا مکمل پتا تحریر کیجئے ۔

۱۱- خط و کتابت کرتے وقت اپنا خریداری نمبر جو لفافے پر پتے کے اوپر درج ہوتا ہے، ضرور لکھئے ۔

مینیجر رسالہ ہمایوں

۳۳- لارنس روڈ- لاہور

کتب خانہ جامعہ عثمانیہ

۱۔ اراکین مجلس اعلیٰ، مجلس رفقاء، مجلس انتظامی، مجالس تعلیمات و نصاب پانچ کتابیں ایک ماہ کے لیے اپنے پاس رکھ سکیں گے۔

۲۔ اساتذہ جامعہ عثمانیہ و کلیات ملحقہ و رجسٹرار و عہدہ داران جامعہ اور اراکین دار الترجمہ دس کتابیں ایک ماہ کے لیے اپنے پاس رکھ سکیں گے۔

۳۔ طلبائے ایم۔ اے، ال ال بی و بی ٹی دو کتابیں، بی۔ اے۔ اور انٹرمیڈیٹ کی جماعتوں کے طلبہ تین کتابیں ایک ہفتہ تک اپنے [illegible] رکھ سکیں گے۔

۴۔ مدت مقررہ پر کتابیں واپس نہ ہوں تو طلبہ سے بحساب ایک آنہ یومیہ فی کتاب جرمانہ لیا جائیگا۔

۵۔ بشرط موقع کتابیں گھر لیجا سکیں گی، کرایہ کی غرض ... کتب خانہ میں کتاب کا لانا لازم ہے۔

۶۔ کتابیں گم یا خراب ہو جائیں تو تشخیص پر وصول داری

۷۔ کتابوں پر کسی قسم کا نشان بنانا یا ان پر لکھنا جائز نہ ہوگا۔

۸۔ قلمی نسخے اور حوالے کی کتابیں جاری نہ کی جا سکیں گی فقط دیکھی جا سکیں گی۔